ISSN : 2582-1229

بین الاقوامی پیر ریویو، ریفریڈ جرنل

(سہ ماہی)

تاریخِ ادبِ اردو

جلد۔۲ شمارہ۔۲

سرپرستِ اعلیٰ: ارتضیٰ کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

سہ ماہی دہلی

تاریخِ ادبِ اردو

(اردو کے تاریخی ادب کا ترجمان)

جلد:۲ شمارہ:۲

اپریل تا جون ۲۰۲۰.

سرپرست اعلیٰ:
ارتضیٰ کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا نائب مدیر: عبداللہ صوفی

سرپرست: ڈاکٹر راکیش کمار پانڈے، پروفیسر رئیس انور رحمٰن، پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر محمد رضی الرحمٰن، ڈاکٹر پرمود کمار بھارتی

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر محمد بہلول مینیجنگ اڈیٹر: صادق اقبال

مجلس مشاورت:

بیرون ملک: پروفیسر یوسف خشک (پاکستان)، پروفیسر ضیا حسن (پاکستان)، پروفیسر حلیل طوقار، (ترکی) ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی (پاکستان)، پروفیسر احمد القاضی (مصر) ڈاکٹر سمیرا بشیر (پاکستان)، پروفیسر ثمینہ گُل (پاکستان)، پروفیسر اسومان اوذکین (ترکی)، پروفیسر دُرمُش بُلگر (ترکی)، فرزانہ اعظم لطفی (ایران)، ڈاکٹر اعجاز رحمت علی (ماریشس)، پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم السعید (مصر)، ڈاکٹر علی بیات (ایران)، ڈاکٹر محمد کیومُرسی (ایران)، ڈاکٹر ذکائیکارداس (ترکی)، ڈاکٹر عبدالمجید حبیب اللہ (مصر)، پروفیسر منور ہاشمی (پاکستان)، پروفیسر نذر عابد (پاکستان)، ڈاکٹر ایمانشکری طحہٰ (مصر)، فاطمہ عمر عبداللہ محمو (مصر) والاسید عبدالستار السید (مصر)، وفایزدان منیش (تہران)، ڈاکٹر تغرید محمد البیومی (مصر)

اندرون ملک: ڈاکٹر خالد اشرف، پروفیسر حبیب نثار، پروفیسر محمد آفتاب اشرف، ڈاکٹر آلِ ظفر، ڈاکٹر افسر کاظمی، ڈاکٹر، مجیب احمد خان، ڈاکٹر نصرت جہاں، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر قمر صدیقی، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد، ڈاکٹر محمد داود محسن، رضوان ندوی، ہاجرہ نور احمد زریاب، ڈاکٹر متھن کمار، ڈاکٹر رحمٰن اختر، ڈاکٹر بلرام شکلا، ڈاکٹر شاہد رزمی، جناب پریم ناتھ بسمل، ڈاکٹر فرخندہ زمیر،

معاونین: فاطمہ خاتون، انعم ستار، ڈاکٹر شبیر عالم، روحی سلطانہ، ڈاکٹر محمد التمش،، ڈاکٹر جابر حمزہ، عریشہ تسنیم، شائستہ مہ جبیں، اناحمیدی، (ایران) محمد نسیم، علما قریشی (ورجینیا)،

قانونی مشیر: ایڈوکیٹ انل کمار سنگھ، ایڈوکیٹ سیما سنگھ

ازتعاون

فی شمارہ	اس شمارے کی قیمت	سالانہ	خصوصی
25	200	1000	5000

رابطہ سہ ماہی ''تاریخِ ادب اردو''

2496,2nd Floor, Punjabi Basti, Subzi Mandi, Ghanta Ghar

Delhi-07

Email : taudelhi@yahoo.com,

A/c Name: PEACE INDIA FOUNDATION

A/c No: 51521131001918

IFSC: ORBC0105152

Mobile No. : +91-9968244001, +91-9430082053

مالک، طابع و ناشر ڈاکٹر محمد یحیٰ صبا نے J.K Offset Printing press, سے چھپوا کر دفتر ''تاریخِ ادب اردو'' 2496nd Floor,Punjabi Basti, Subzi Mandi,Ghanta Ghar Delhi-7 سے شائع کیا۔

''تاریخِ ادب اردو'' کی مشمولات سے مدیر/وابستگان کا متفق ہونا لازمی نہیں۔ ''تاریخِ ادب اردو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حقِ سماعت صرف دہلی کی عدلیہ میں ہوگا۔

مشمولات

اداریہ

مضامین

نئی صدی کے اردو افسانوں میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	ڈاکٹر محمد محسن		06
بہادر شاہ ظفر۔۔۔۔۔	ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا		12
راہی شہابی شخصیت اور سوانح۔۔۔۔	ڈاکٹر شیریں فاطمہ		23
ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی آپ بیتی۔۔۔	ڈاکٹر محمد ارشد حسین		43
شاہ مقبول احمد کے افسانے۔۔۔۔	فاطمہ خاتون		49
بہار میں خواتین اردو افسانہ نگار۔۔۔۔	محمد اجمل		62
اسلم پرویز اسلم بحیثیت رباعی گو۔۔۔۔۔	خوشبو پروین		70
احتشام حسین کی افسانہ نگاری۔۔۔۔۔	کشف الدجیٰ		78
اردو افسانے کا اولین معمار۔۔۔۔۔۔۔	دنیش کمار		82
ہاڑوتی کا حالیٔ ثانی۔۔۔۔۔۔۔	روشن آر		88
ہندو مذہب کی تعلیمات۔۔۔۔۔۔	ڈاکٹر گلزیدہ خان		95
ہندی کہانی میں دلت مسائل	صادق اقبال		105
نیر مسعود کا افسانہ ''بائی کے ماتم دار''۔۔۔ افسانے۔۔۔	ڈاکٹر محمد کلام		112
محبت لاک ڈاؤن۔۔۔	ڈاکٹر شریں فاطمہ		116
مَنّت ٹیلرس	ڈاکٹر پرگیہ روہنی	(ترجمہ) حفیظ بن عزیز	118

اداریہ

الحمداللہ تاریخ ادب اردو کا تازہ شمارہ منظر عام پر آنے کو تیار ہے۔ میں اپنے قارین کا بہت شکر گزار ہوں کہ سابق شماروں کو جس طرح پسند کیا گیا اس سے کافی حوصلہ ملا۔

اس شمارے کی اشاعت میں تاخیر کے سبب سے آپ سبھی واقف ہوں گے۔ دنیا بھر میں کرونا وائرس کی وبا نے جس طرح معمول کی زندگی کو متاثر کیا ہے اس سے زندگی کا کوئی بھی شعبہ اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ مقالہ نگاروں سے وقت پر مضمون حاصل کر لینے کے بعد بھی بہت سی پیچیدگیاں راہ میں حائل تھیں۔ پورے ملک میں مکمل لاک ڈان اور آمد و رفت کے ذرائع بند ہونے کی وجہ سے رسالے کی اشاعت میں دیری ہوئی۔

جلد دوم کا دوسرا شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں موصول ہوئے مقالات میں سے انتخاب کیے گئے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ تمام ہی مقالے معیار کی کسوٹی پر پرکھے گئے ہیں۔ کوشش کر کے ان مقالات کو ضرور شامل کیا گیا ہے جو اس میں اشاعت کے حقدار تھے۔ لیکن پھر بھی بعض مقالے ایسے ضرور ہیں جو معیار کے پیمانے پر اترنے کے باوجود رسالے میں جگہ نہیں پا سکے۔ ایسے مقالہ نگاروں کو میں امید دلاتا ہوں کہ ''تاریخ ادب اردو'' کے آئندہ شماروں میں ان کے مضامین کو ضرور شامل کر لیا جائے گا۔ اس شمارے میں شامل مقالات اس طرح ہیں ''نئی صدی کے اردو افسانوں میں عالمی مسائل''، ''بہادر شاہ ظفر اور 1857ء''، ''راہی شہابی شخصیت اور سوانح''، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی آپ بیتی، یادوں کی دنیا کا تجزیاتی مطالعہ''، وغیرہ شامل ہیں۔

رسالہ ''تاریخ ادب اردو'' اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اردو ادب کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ رسالے میں شامل تمام ہی مقالات اردو ادب بالخصوص اردو تنقید کے میدان میں قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام ہی مقالے چاہے وہ جس موضوع کا احاطہ کر رہے ہوں، اپنے اندر جدّت اور تنقیدی بصیرت کا عنصر رکھتے ہیں۔ اس طرح سے ''تاریخ ادب اردو'' کا یہ شمارہ اردو ادب و تنقید کے باب میں ایک قیمتی سرمایہ اور دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

مدیر

نئی صدی کے اردو افسانوں میں عالمی مسائل

ڈاکٹر محمد محسن
کروڑی مل کالج، دہلی

ملخص

بیسویں صدی کی نوویں دہائی تھی جب جدیدت کا خاتمہ ہوا اور افسانہ نگار جدیدیت کی قید و بند سے آزاد ہوئے۔ اب افسانہ نگاروں نے اپنی ذات سے نکل کر دنیا کا جائزہ لیا، جہاں بے شمار مسائل سر اٹھائے ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ادیب اپنے سماج کا ناصح ہوتا ہے مگر جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے جہاں کے کونے کونے کی دوریاں مٹ رہی تھیں۔ آفاقی گاؤں کا نظریہ بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس وقت ہمارے افسانہ نگاروں کے سامنے اپنے وطن اور سماج کے لامحدود مسائل تھے۔ ان کا پہلا فرض اپنے ملک اور سماج کی رہنمائی تھا لہٰذا یہ فرض انہوں نے بخوبی نبھایا۔ لیکن جب بھی کوئی عالمی سطح پر واقعہ، حادثہ یا تبدیلی رونما ہوتی تو ہمارے افسانہ نگار بھی قلم اٹھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہونی چاہیے کہ جدیدیت نے افسانے کو سماج کی جھولی سے نکال کر انفرادیت کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اس لئے سماجی و ملکی مسائل سے افسانہ بالکل الگ ہو چکا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں جب جدیدیت کا خاتمہ ہوا تو افسانہ نگاروں کے سامنے اتنے مسائل تھے کہ ان کو ایک ایک کر کے سمیٹنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لئے افسانہ نگار عالمی سطح کے مسائل کی طرف زیادہ توجہ نہ دے پائے۔

☆☆☆☆

اکیسویں صدی تک آتے آتے دنیا کے زیادہ تر ممالک خطرناک جنگی ہتھیاروں اور ایٹمی ہتھیاروں کے مالک بن چکے تھے۔ اس کے علاوہ سائنس اور ٹکنولوجی کی مدد سے دوریاں دن بہ دن مٹتی جا رہی تھیں۔ امریکہ کے ظالمانہ تسلط سے پوری دنیا متاثر ہو رہی تھی۔ ایٹمی ممالک اپنی قوت کے بل پر ایک دوسرے پر دھاڑنے لگ گئے اور دنیا کو خطرناک جنگ کا شبہ ہونے لگا۔ دوسری طرف سائنس اور ٹکنولوجی کی ترقی کی وجہ سے ماحولیات کا نظام

درہم برہم ہونے لگا۔آلودگی پھیلنے لگی جس سے کئی خطرناک بیماریوں نے جنم لیا۔اسی طرح جہاز، ٹیلی وژن اورفون کے ذریعے عالمی سطح پرعوام کے درمیان نزدیکیاں بڑھنے لگیں۔یعنی پوری دنیا ایک گاؤں کی صورت اختیار کرنے لگی ۔عالمی تعلقات کا یہ سلسلہ کافی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کررہا تھا۔

بیسویں صدی کا خاتمہ ہوا تو اکیسویں صدی کے آغاز میں ہی تاریخ کے مسئلے نے جنم لیا اس کے ساتھ ہی دوسرا مسئلہ یہ سامنے آیا کہ اکیسویں صدی کا آغاز ۲۰۰۰ء سے ہوتا ہے یا ۲۰۰۱ء سے۔ یہ دونوں مسئلے نئی صدی کے بالکل پہلے دن کے ہیں۔اب سوچئے صدی کے پہلے ہی دن لوگ الجھن میں پڑ گئے تو آنے والا وقت کس نہج کا ہوگا ۔وہ سلسلہ جو بیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ اکیسویں صدی میں مکمل ہونے لگا ۔ایٹمی ہتھیاروں میں زیادہ تر ممالک نے کامیابی حاصل کرلی،جنگی ہتھیاروں سے فوجیں اور مضبوط ہوگئیں، ٹیلی فون کے بجائے موبائل فون ہر گھر تک پہنچ گئے ،رہی سہی کسر ٹی وی نے پوری کردی،انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا مگر ترقی اور کامیابی جتنی بڑی ہوتی ہے اس کا دوسرا پہلو اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ان چیزوں کے برے اثرات بھی دنیا نے دیکھے۔آلودگی اور وائرسز کی بدولت ماحولیات میں خطرناک تبدیلی آنے لگی جس کی وجہ سے کئی خطرناک بیماریاں پھیل گئیں ، ایٹمی ہتھیاروں کی وجہ سے پورے دنیا پر خطرے کے بادل منڈلانے لگے۔گویا ایک جنگ ہوئی تو پوری دنیا منٹوں میں ختم ہوسکتی ہے۔ان سب کے علاوہ دہشت گردی کی حرکات میں بھی اضافہ ہوتا گیا جس کی وجہ سے بڑے بڑے حادثات وواقعات دنیا نے برداشت کئے۔عالمی سطح پر امریکہ کا کردار بھی دنیا کے لئے پریشانی کا باعث بنا رہا۔ان تمام چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک عام انسان کیسے چین کی سانس لے سکتا ہے۔ان عالمی مسائل کے اثرات ہر انسان پر پڑے۔چونکہ دنیا انٹرنیٹ اور ٹکنولوجی کی مدد سے گلوبل ویلیج کی صورت اختیار کرچکی تھی۔اب ہمارے ادیب بھی سماجی اور وطنی مسائل کے علاوہ عالمی مسائل کی طرف متوجہ ہوچکے تھے۔بیسویں صدی کے مقابلے میں اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی ہمارے افسانہ نگاروں نے عالمی مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔آج اگر اکیسویں صدی کے افسانوں کا غور سے جائزہ لیا جائے تو عالمی سطح پر واقع ہونے والے ہر واقعے ،حادثے ،تبدیلی اور مسئلے پر ہمارے ہاں کئی کئی افسانے ملیں گے۔مندرجہ ذیل ہم چند عالمی مسائل کے پس منظر میں اردو افسانوں کا جائزہ لیں گے۔

اکیسویں صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ملکوں کا ایٹمی ہتھیاروں اور باقی خطرناک جنگی ہتھیاروں کی دوڑ میں ہر کسی سے آگے نکلنے کا ہے۔اس دوڑ کا مقصد ملکی طاقت کو بڑھانا ہے۔بہت سارے ممالک ایٹمی ہتھیاروں کے گڑھ بن چکے ہیں۔ایٹمی ہتھیاروں کے علاوہ سائنس نے اور بھی بے شمار ایسے ہتھیار ایجاد کیے ہیں جو چند سیکنڈ میں ایک بڑے علاقے کو اپنی ضد میں لے سکتے ہیں۔اب اتنے خطرناک ہتھیار ہونے کے باوجود ملکوں کی آپس

میں رنجشیں اور خطرناک بیان بازی ایک عام انسان کو کہاں چین سے سونے دے سکتے ہیں۔اس حوالے سے انتظار حسین کا افسانہ ''مورنامہ'' کافی اہم ہے۔اس افسانے کا موضوع راجستھان میں کئے گئے ایٹمی تجربے ہیں۔ایٹمی ملک بننا تو اچھی بات ہے مگر یہ کہاں کی بہادری ہے کہ ان کے تجربات وہاں ہوں جہاں جانوروں اور پرندوں کی بستیاں آباد ہوں۔دنیا کی اس رسا کشی میں جانوروں اور پرندوں کا خاتمہ اس افسانے کا موضوع ہے۔اس کے علاوہ مصنف نے دنیا کے باقی ممالک میں ہورہی تباہی کے سے بھی قارئین کو روشناس کروایا ہے۔

محمد حامد سراج نے اپنے افسانہ ''گلوبل ویلج'' کے ذریعے ایٹمی ہتھیار ایجاد کرنے اور ان کے ذخائر جمع کرنے کے عمل پر طنز کیا ہے۔اس افسانے کا موضوع امریکہ کی وہ نیوکلیر حکمت عملی ہے جس کے ذریعے اس نے ایٹمی ہتھیاروں کی ضرورت کے متعلق اپنی پالیسی دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔جلانی بانو کا افسانہ ''عباس نے کہا'' عراق میں ہونے والی جنگ کو موضوع بناتا ہے۔یہ افسانہ ریڈیائی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔اس افسانے میں نیوز رپورٹرز کے ذریعے جنگ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے اور جنگ کی حولنا کی اور تباہی کو ظاہر کیا ہے۔اسی موضوع پر فردوس حیدر کا افسانہ ''خالی ہوا یہ دل'' امراو طارق کا ''آتش فشاں کی گود میں'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عالمی سطح پر ایک اہم مسئلہ دہشت گردی کا ہے اور اس صدی کے آغاز میں ہی دہشت گردوں کی حرکات میں کافی اضافہ دیکھنے کو ملا ہے۔امریکہ میں نائن الیون کا حملہ ہو یا ہندوستان کے تاج ہوٹل کا حملہ یا پھر پاکستان میں اسکولی بچوں کا قتل دہشت گردوں کے خطرناک منصوبے دنیا نے دیکھے ہیں۔دہشت گردی کے پیچھے اگرچہ بین الاقوامی سطح پر بڑی بڑی تنظیموں کے ہاتھ ہیں مگر ساری ذلت اسلام کو برداشت کرنی پڑ رہی ہے۔دہشت گردی کے موضوع پر خالدہ حسین کا افسانہ ''ابن آدم'' کافی اہمیت کا حامل ہے۔یہ افسانہ امریکہ عراق جنگ کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔اس افسانے میں عام انسانوں کا دہشت گردی کا روپ اختیار کرنے کا پس منظر دکھایا ہے اور اس کا انجام بھی ظاہر کیا ہے۔انتظار حسین کا افسانہ ''ریز روسیٹ'' بھی دہشت گردی کے موضوع پر لکھا گیا ہے مگر اس افسانے میں دہشت گردوں کا دوسرا روپ دکھایا ہے۔یہ دہشت گردی لامذہب ہے۔اس افسانے کے آخر میں جس طرح دہشت گرد منہ ڈھانپ کر ایک مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے لوگوں پر حملہ کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے رحمی کی آخری حدوں سے گزر چکے ہیں۔اسی موضوع پر زاہد حنا کا افسانہ ''رقص بسمل'' بھی ہے۔

ماحولیات کی خرابی بھی عالمی سطح پر ایک بڑا مسئلہ ہے۔دنیا جتنی ترقی کی طرف بڑھ رہی ہے اتنے ہی اس کے برے اثرات ماحولیات پر پڑ رہے ہیں۔آبادی پھیل رہی ہے جنگلات سکڑ رہے ہیں، کارخانوں اور مشینوں سے آلودگی اور گندہ پانی تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کی وجہ سے کئی طرح کی خطرناک وائرسز جنم لے رہی ہیں وغیرہ ان تمام چیزوں کی بدولت کئی خطرناک بیماریاں جنم لے چکی ہیں، پینے کا صاف پانی

غائب ہوتا جارہا ہے، ٹیمپریچر تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہ سب مسائل ترقی کا دوسرا پہلو ہیں۔نئی صدی کے افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر بھی قلم اٹھایا۔اس حوالے سے سب سے اہم نام محمد فرقان سنبھلی کے افسانہ ''آب حیات'' کا ہے۔اس افسانے کا موضوع ماحولیات کی خرابی کی وجہ سے پینے کے پانی کا دن بہ دن گھٹنا ہے۔اس افسانے میں مرکزی کردار عادل کے جہاز کو ایک خاتون اپنے سیارے پر لے جاتی ہے۔ یہاں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اس قدر عروج پر تھی کہ لوگ ہواؤں میں اڑتے تھے۔مگر ایک چیز کے لئے پوری دنیا تڑپتی تھی اور وہ چیز پانی تھا۔پانی کی جگہ یہ لوگ گیسز کا ستعمال کرتے تھے۔

ماحولیات کے موضوع پر ایک افسانہ مہتاب عالم پرویز کا ''کارواں'' کافی اہم ہے۔ یہ افسانہ ماحولیات کے برے اثرات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار سعودی عرب میں اونٹیں چرانے کا کام کرتا ہے اور وہاں گیس کے ذریعے ہونے والی تباہی افسانے کا موضوع ہے۔اختر آزاد کے افسانے ''پانی'' کا موضوع بھی پانی کی آلودگی ہے۔حامد سراج کا افسانہ ''میکینک کہاں گیا'' WHO کی پالیسوں پر طنز کرتا ہے۔ اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''پانی اور پیاس'' پانی کی قلت اور اہمیت پر بڑا عمدہ افسانہ ہے۔

فرقہ وارانہ تعصب بھی عالمی سطح پر ایک بڑا مسئلہ ہے۔اس تعصب کی وجہ سے انسانی تاریخ میں بڑی بڑی جنگیں ہو چکی ہیں۔ یہ مسئلہ ازل سے اب تک برقرار ہے۔اور اس صدی میں فرقہ وارانہ تعصب میں اور بھی اضافہ دیکھنے کو ملا ہے۔عراق، ایران، فلسطین، رہنگیا وغیرہ میں جو تباہی آئی ہے اس کا ذمہ دار یہی فرقہ وارانہ تعصب ہیں۔اس موضوع کے حوالے سے ایم موبین کا افسانہ ''نئی صدی کا عذاب'' کافی اہمیت کا حامل ہے۔
اس افسانے میں انہوں نے بڑی بہادری سے اس دور کے ظالموں کو بے نقاب کیا ہے۔دہشت گردی کے نام سے مسلمان کیوں بدنام ہیں۔آخر اس بدنامت کا خاتمہ کیوں نہیں ہو رہا۔ ہر مسلمان کو شک کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔ افسانے کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

''داڑھی والا۔۔۔۔''
'' پکڑو! اے بچ کے جانے نہ پائے''
''مارو اسے مارو۔۔۔۔۔ یہ دہشت گرد ہے، اس ساری تباہی کا ذمہ دار ہے''
(افسانہ۔نئی صدی کا عذاب۔ایم موبین)

اسی موضوع کے حوالے سے محمد ارشد کسانہ کا افسانہ ''شرنارتھی'' بھی اہم ہے جس کا موضوع رہنگیا میں

ہونے والے فسادات ہیں۔نئی صدی میں فرقہ پرستی کا سب سے بڑا واقعہ دنیا نے برما میں دیکھا۔برما میں بودھ مذہب کے ماننے والے اکثریت میں ہیں اور وہاں مسلمانوں کی آبادی نہایت ہی کم ہے۔جب وہاں فرقہ پرستی نے قدم رکھا تو اس کے نتائج وہاں کے مسلمانوں کو بھگتنے پڑے۔فرقہ پرستی کی اس آگ نے جلد ہی وہاں طوفان برپا کر دیا۔مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا۔اسی وجہ سے مسلمانوں نے برما سے ہجرت کرنی شروع کر دی۔ مگر دنیا کے کسی بھی ملک نے رہنگیا مسلمانوں کو نہیں اپنایا۔اس پورے منظر کو ہم افسانہ ''شرنارتھی'' میں دیکھ سکتے ہیں۔اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''عیدگاہ سے واپسی'' فرقہ پرستی کے حوالے سے ایک عمدہ مثال ہے حالانکہ اس افسانے کا تعلق بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہندوستان میں پیدا ہونے والے وہ حالات ہیں جنھوں نے پورے ملک میں فرقہ پرستی کی زہریلی ہوا پھیلا دی تھی۔اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''عیدگاہ سے واپسی'' پریم چند کے افسانے ''عیدگاہ'' کی توسیع ہے۔پریم چند کے افسانے ''عیدگاہ'' کا مرکزی کردار سات سالہ حامد ہے اور اسلم جمشید پوری کے افسانے ''عیدگاہ سے واپسی'' کا مرکزی کردار وہی حامد ہے مگر اب اس کی عمر ستر سال ہے۔ان حالات میں حامد اپنے پوتے کے ساتھ دوسرے گاؤں میں عید کی نماز ادا کرنے جاتا ہے۔بابری مسجد کی شہادت کے بعد پورے بھارت میں نفرت کی آگ پھیلی ہوئی تھی۔حامد اور اس کا پوتا عید کی نماز پڑھ کر واپس لوٹ رہے تھے کہ اچانک اس فرقہ پرستی کی وجہ سے فسادات شروع ہو گئے اور پھر اسی فسادات کی زد میں دادا پوتا بھی آ گئے یوں ان دونوں کی موت ہو گئی۔حامد پریم چند کے افسانے کا کردار تھا جسے اسلم جمشید پوری نے اپنے افسانے میں ستر سال کا بزرگ بنا کر فرقہ پرستی کی آگ میں جلا دیا۔یہ ایک ایسا مسلہ ہے جس نے آہستہ آہستہ پوری دنیا کو برباد کر دیا ہے۔کشمیر، فلسطین، عراق، ایران، روہنگیا وغیرہ جیسی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔اس افسانے کے علاوہ اس موضوع پر نئی صدی میں بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں۔

نئی صدی میں ایک اور مسئلہ بڑی تیزی سے ابھرا ہے اور وہ ہے قدروں کا زوال۔آج ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں پرانی تہذیبیں مٹتی جا رہی ہیں، بزرگوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، لوگوں میں احساس ختم ہو رہا ہے، روایت آخری سانس لی رہی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے مگر نئی صدی میں پوری دنیا کے اندر اس مسلے نے بڑی سنجیدگی سے سر اٹھایا ہے۔ان مٹتی قدروں اور انسان کی لاپرواہی کے پیچھے سب سے بڑا ہاتھ انسان کی مصروفیات کا ہے۔جہاں اردو ادب نے اس موضوع کو خاص طور پر اٹھایا ہے وہیں اردو افسانوں میں بھی اس مسئلہ کو ہم بڑی تعداد میں دیکھ سکتے ہیں۔نئی صدی میں اس مسئلہ پر بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں۔اس حوالے سے ہم شاہد اختر کا افسانہ ''مونٹی'' کو مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔یہ افسانہ ایک ایسی عورت کی ترجمانی کرتا ہے جو ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور نہایت عزت اور ایمانداری سے اپنی زندگی گزارتی ہے۔لیکن اپنی ذمہ

داریاں نبھانے میں اس قدر مصروف رہتی ہے کہ وہ اپنی شادی کی عمر کا خیال ہی بھول جاتی ہے۔آج دنیا جس قدر ترقی کی چاہ اور لالچوں میں مصروف ہے اسی وجہ سے اپنی تہذیب، اپنی روایت، اپنے بزرگوں وغیرہ کو انسان بھولتا جارہا ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زندگی کو بھی نظر انداز کرتے جارہے ہیں۔

اسی موضوع کے حوالے سے اختر آزاد کا علامتی افسانہ ''بابل کا مینار'' بھی کافی اہم ہے اس افسانے میں افسانہ نگار نے دنیا کی اس ترقی کو بے نقاب کیا ہے جس کی راہ پر لوگ اس طرح گامزن ہو چکے ہیں کہ ساری قدریں، سارے احساسات بھول کر وہ اپنی ترقی میں محو ہو چکے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ وہ قدرت کے ساتھ کھلواڑ کا کام کررہے ہیں۔اس کا انجام یوں دکھایا ہے کہ وہ مینار جس کو بنانے میں ان کو بہت محنت کرنی پڑی ایک ہی لمحے میں ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے اس کے علاوہ بھی اس مسئلہ پر بے شمار افسانے نئی صدی میں لکھے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا مختصر جائزے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو افسانہ نگاروں نے آفاقی گاؤں کے نظریے کو کس طرح سے اپنایا ہے۔اکیسویں صدی میں عالمی مسائل کی گونج زیادہ رہی ہے اور یہ مسائل ہر خاص و عام کے لئے زیادہ اہمیت اس لئے رکھتے ہیں چونکہ ان کا برائے راست تعلق آنے والی نسلوں سے ہے۔اس لئے ہر ادیب کا فرض ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کا موضوع ان مسائل کو بنائے جو موجودہ اور آنے والی دونوں نسلوں کے لئے کارآمد ہوں۔اب جیسے جیسے آفاقی گاؤں کا نظریہ جڑ پکڑتا جارہا ہے ویسے ویسے اردو افسانہ نگاروں کے موضوعات بھی پھیلتے جارہے ہیں۔امید ہے آنے والے وقت میں عالمی مسائل کو مزید توجہ کا مرکز بنایا جائے گا۔

بہادر شاہ ظفر اور 1857

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا
شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج،
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی 110007

ملخص

کہا جاتا ہے کہ آرٹ زمانۂ سکون میں پروان چڑھتا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اردو شاعری کے بامِ عروج پر پہنچنے کا عہد نہایت ہی جاں سوز عہد ہے۔ ایسا عہد جس میں ہر سطح پر تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ علمی میدان میں سائنس کا عمل دخل اسی عہد میں بڑھ رہا ہے۔ ہندوستان گیر پیمانے پر انگریزوں کا تسلط اسی دور میں قائم ہوا۔ وطنیت کا جذبہ اسی دور میں برگ و بار لایا۔ غزل کے مقابلے میں موضوعاتی نظموں کو انگریزوں کے ایما پر اسی دور میں رواج دیا گیا، تجربے کے طور پر ہی سہی۔ اودھ کے نواب کو اسی دور میں گرفتار کیا گیا، مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو اسی عہد میں قید کر کے رنگون بھیجا گیا اور اسی عہد میں عوام میں ایک زبردست سیاسی تبدیلی یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ ملک گیر پیمانے پر انگریزوں کے خلاف احتجاج کے شعلوں نے ایک مسلح جدوجہد کی شکل اختیار کر لی جسے انگریزوں نے 1857 کا غدر کہا۔ اور اس جدوجہد میں پہلی بار اور شاید آخری بار بھی تمام ہندوستانی صرف اور صرف ہندوستانی بن گئے اور اسی جدوجہد نے یہ طے کر دیا کہ انگریزوں کو جلد یا دیر میں ہندوستان سے واپس جانا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

شاعری خود ادب ہے اور ادب کا بڑا حصّہ شاعری ہے شاعری کی تعریف مغرب و مشرق میں مختلف زاویوں سے ہوئی لیکن کل ملا کر شاعری کا معاملہ آج بھی وہیں ہے کہ بقول شبلی:

''جو جذبات الفاظ کے ذریعہ ادا ہوں شعر ہے''

نہ جانے حضرت انسان کے سر میں یہ سودا کب سمایا کہ وہ اپنے دلی جذبات کو مشتہر کرے ضرورتاً بھی اور بغیر ضرورت کے بھی لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس امر نے دنیا میں آرٹ کی بنیاد ڈالی۔ یہ بات تو مسلّم ہے کہ اس روئے زمین پر کامیاب آرٹ کے جتنے بھی نادر نمونے ہیں وہ سب دلی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ شاعری بھی آرٹ ہے اور اس میں بھی کامیاب شاعر وہی قرار پاتا ہے جو دلی جذبات کو بخوبی شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ ملٹن نے شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''شعر الفاظ کا ایسا استعمال ہے کہ اس سے تخیل دھوکہ کھا جائے۔ مصور رنگ کی مدد سے جو کام کرتا ہے اس کو الفاظ کے ذریعہ سرانجام دینے کی صنعت کا نام شاعری ہے''

فارسی میں نظامی عروضی السمر قندی نے بھی شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''شاعری ایسی صنعت ہے جس کی بدولت موہومات کی ترتیب سے چھوٹی چیز بڑی اور بڑی چیز چھوٹی کر کے دکھائی جاتی ہے اور اچھی چیز کو بدنما اور بری چیز کو خوش نما ثابت کیا جاتا ہے تاکہ انسان کے جذبات مشتعل ہوں اور طبیعت پر انبساط یا انقباض کی کیفیت طاری ہو اور یہ دنیا میں مہتمم بالشان کارناموں کا سبب بنے۔'' (چہار مقالہ باب شاعری)

اپنے جذبات کو مشتہر کرنے سے دوسروں کے جذبات مشتعل ہوں اور اگر یہ کام قصداً کیا جائے تو ایسی شاعری بھی مقصدیت کے زمرے میں داخل ہوگی۔ یقیناً بہادر شاہ ظفر اسی زمرے میں شامل شاعر ہیں بھلے ہی ان کا تعلق کلاسکی عہد سے رہا ہو۔ غزل اور بہادر شاہ ظفر کا ذکر آتے ہی اٹھارھویں اور انیسویں صدی پر محیط ادبی منظر نامے کا عکس ذہن کے پردے پر تھرکنے لگتا ہے بالخصوص اٹھارھویں صدی کا نصف آخری اور 19 ویں صدی کا نصف اول حصّہ جو بہادر شاہ ظفر (پیدائش 14 اکتوبر 1775 اور وفات 7 نومبر 1862) کا عہد بھی ہے۔ یہ دور نہ صرف یہ کہ اردو شاعری کا ایک اہم دور ہے بلکہ یہ وہ عہد ہے جس میں سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی سطح پر جتنی تبدیلیاں ہندوستان میں ہوئیں شاید ہی کسی دور کو ایسا انقلابی رویّہ میسّر آیا ہو۔

بہادر شاہ ظفر نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اسے چہار دانگ ہندوستان تک پھیلی ہوئی حکومت

قلعے کی چہار دیواری تک سمٹی ہوتی نظر آئی اور قلعے میں بھی ان کی حکومت کیسی جب کہ وہ انگریزوں کے ذریعہ دیئے جانے والے ایک لاکھ کے پنشن یافتہ تھے اور قلعے کے اندر بھی انگریزی ریزیڈنٹ کے احکام کو اولیت حاصل تھی۔لیکن ان سب باتوں کے باوجود بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھے اور عوام کی ہمدردیاں اور محبتیں انھیں حاصل تھی۔ظاہر ہے یہ ایک بڑی طاقت تھی اور اسی کے بل پر وہ بادشاہ کہے جاتے رہے۔

بہادر شاہ ظفر کے دور کو یوں بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس دور میں تعلیم کا رشتہ سائنس سے جڑ گیا۔ پریس کی ایجاد ہوئی اور پہلی بار دہلی میں ایک ایسے کالج کی بنیاد پڑی جس میں جدید تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اخبارات کا اجرا ہوا اور سائنسی ایجادات کا اثر براہ راست معاشرے پر پڑنے لگا تھا۔یہ ہی نہیں بلکہ اس دور میں ایک سے ایک صاحبِ فہم وادراک شخصیات دہلی میں موجود تھیں جن کے افکار وخیالات آج بھی مستند سمجھے جاتے ہیں اور اس دور کے بعد ایسی نادرالوجود شخصیات بیک وقت دہلی میں پھر جمع نہ ہوسکیں۔سرسید نے لکھا ہے کہ:

> ''دہلی اہلِ کمال کا مرکز ہے ان اہلِ کمال میں اس دور کے اطبّا بھی شامل ہیں،اس میں کوئی شک نہیں کہ ظفر کے زمانہ تک یہی صورتِ حال تھی اہلِ علم میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ ان کے برادران عزیز شاہ عبدالقادر،شاہ رفیع الدین شاہ اسماعیل شہید شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی جیسے اہل علم موجود تھے جن کی وجہ سے بعد میں علم حدیث ہندوستان بھر میں پھیلا اور محدث ہونا بہت بڑے مذہبی وعلمی وقار کی بات سمجھی جاتی ہے۔''
>
> (آثارالصنادید،ص:518-517)

اس کے علاوہ مرزا غالب،مولوی امام بخش صہبائی،مومن خاں مومن،مولوی رشید الدین خاں، مولانا فضل حق خیرآبادی ان کے والد مولانا فضل امام خیرآبادی،مفتی صدرالدین آزردہ جو مرزا غالب کے خاص دوست تھے،مولانا مملوک علی اس زمانہ کے دہلی کالج کے معروف اساتذہ میں سے تھے ظفر کے استاد شیخ ابراہیم ذوق،حکیم آغا جان عیش،حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان اس کے علاوہ ذوق کے پہلے ظفر اور ذوق دونوں کے استاد شاہ نصیر بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس دور میں دہلی باکمالوں کا منبع تھا اور ایک سے ایک نابغۂ روزگار اہل کمال کا تعلق براہِ راست بہادر شاہ ظفر سے رہا اور اسی ماحول میں ان کی شاعری نے وجود حاصل کیا۔

بہادر شاہ کا تعلق آرٹ سے براہِ راست رہا اس سلسلے میں پروفیسر اسلم پرویز نے لکھا ہے کہ:

''ظفر کو فنونِ لطیفہ سے بے حد دلچسپی تھی چنانچہ موسیقی، خطاطی، مصوری، نقاشی اور شاعری ان تمام فنون میں ظفر گہری دلچسپی لیتے تھے اور خود بھی کئی خطّوں میں امتیاز رکھتے تھے۔''

(بہادر شاہ ظفر مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ڈاکٹر اسلم پرویز ص:374)

اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ظفر جس دور کی نمائندگی کرتے ہیں اسی دور کی نمائندگی شاہ نصیر ذوق غالب اور مومن بھی کرتے ہیں لیکن ظفر کا معاملہ جن مراحل سے ہوتا ہے دوسرے ہمعصر شعرا کسی نہ کسی حد تک اس سے الگ ہیں۔ ظفر بادشاہِ وقت بھی ہیں اور پنشن یافتہ بھی ان کے آباء واجداد نے جس مغلیہ حکومت کی بنیاد ڈالی تھی اور جس کا شہرہ پوری دنیا میں تھا اس مملکت کو وہ دیکھ رہے تھے لیکن اس پر اپنا حکم نہیں چلا سکتے تھے۔ جس قلعہ معلیٰ میں ان کا مسکن تھا وہاں بھی وہ کسی نہ کسی حد کے پابند تھے۔ ان کے آباء واجداد نے جس دیوان عام، دیوان خاص یا رنگ محل میں جواہر لٹائے تھے آج وہاں وہ بنیوں سے قرض لینے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ وہ سارے حقائق ہیں جس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ظفر کو جو ذاتی تجربات ہوئے وہ اسی عہد کے دوسرے شعرا سے یکسر الگ اور ذاتی تھے اور یہی سبب ہے کہ ظفر کی شاعری کے اندرون میں کرب ایک لازمی جز کی حیثیت رکھتی ہے ایسا نہیں کہ اس کرب کی پرچھائیں غالب نصیر یا مومن کی شاعری پر نہیں پڑ رہی ہے لیکن ظفر کا یہ سارا کرب ذاتی کرب بن کر ان کی شاعری میں توانائی کا جوہر بن گیا ہے ؎

گلشنِ دہر میں گلچینِ خزاں کا ہو برا
جس نے بوئے ہیں مرے حق میں سراسر کانٹے
ہم صفیر و مری فریاد و فغاں گلشن میں
آہ کیا ہوتا جو پاس آ کے قفس کے سنتے

گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے
وہ کیا کریں کہ غنچہ بھی مرجھا کے جھڑ پڑے
کہوں بگولے کو کیا خاک میں بیاباں گرد
کہ میری طرح سے دیکھے کہاں نشیب و فراز
مجھے رونا تو یہ ہے مثلِ شبنم اے گلِ خنداں
کہ جب روتا ہوں تیرے روبرو تو اور ہنستا ہے
شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے

قفس، گلچیں، صیاد، گل، شمع، شبنم، فغاں، خزاں، چمن یہ سارے الفاظ ان چند اشعار میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور غور کریں تو ظفر کی پوری شاعری میں یہ الفاظ صرف لفظ بن کر نہیں رہ گئے بلکہ ہر لفظ کسی نہ کسی طویل داستان کا عنوان ہے اور اس لفظ کا سیاق اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ ظفر کے اندرون میں جو کرب کا طوفان پوشیدہ ہے یہ الفاظ اس کرب کی سفارت کر رہے ہیں اور ظاہر ہے وہ کرب اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔

ظفر کی شاعری پر بات کرتے وقت اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کی سنگلاخ زمینوں کی سطح کو توڑنے میں پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں اور اس مشکل کام کو ظفر کی مشکل پسندی کا نام دے دیتے ہیں۔ ظفر کی مشکل پسندی تو اس دور سے مستعار ہے۔ ظفر سے ہم یہ توقع کیونکر کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے غالب رجحان مشکل پسندی سے باہر نکل کر ناصر کاظمی یا باقی جیسی شاعری کرنے لگتے۔

ظفر کے استاد شاہ نصیر اور ذوق ہیں اور اس دور میں جو شعرا ہیں وہ ہیں مرزا جان عیش، حافظ عبدالرحمٰن عیش، حافظ عبدالرحمٰن احسان، میر نظام الدین ممنون مومن خاں مومن اور خود غالب اور سنگلاخ زمین اور مشکل سے مشکل ردیفوں کو استعمال کرنے کے طریقہ سے اس دور میں شاعری کا معیار طئے کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے بادشاہِ وقت اس رنگ سے اپنے آپ کو الگ کیونکر کرتے جب کہ قلعہ معلّیٰ کا اندازِ بیان ہی نہیں وہاں کی نشست و برخاست وہاں کے لباس اور وہاں کی زبان عوام میں سندِ افتخار کا درجہ رکھتی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے جو سرخیل ہیں دشمنانِ اردو غزل کے، روایت کے، اقدار کے اور خاص طور

پر مغلیہ حکومت کے اور ہمدرد ہیں انگریزوں کے انھوں نے آبِ حیات میں ایک مقام پر اپنے والد کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ اپنے دوست ذوق سے کہا کرتے تھے کہ:

''بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے خوب خوب طرحیں نکالتا ہے لیکن انھیں سرسبز نہیں کرسکتا اس کا کیا ہوا تم کرتے ہو'' (نوائے ظفر ص:7)

اس اقتباس سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ بہادر شاہ ظفر ذوق کے بادشاہ ہیں۔محمد حسین آزاد کے والد انھیں اپنا بادشاہ نہیں سمجھتے اور دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ محمد حسین آزاد کو اس رنگ کی شاعری سے جو رنگ اس دور کا غالب رنگ ہے۔اس کی وضاحت ان کے اس اقتباس سے بخوبی ہو جاتی ہے جس میں انھوں نے مصحفی کے حوالے سے اپنی بات کہی ہے:

''الفاظ کو کم وبیش اور مضمون کو پس وپیش کر کے کچھ ایسا رکھ دیا ہے کہ جو حق استادی کا ہے وہ ادا ہو گیا ہے'' (آبِ حیات ص: 67)

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ عہدِ ظفر میں شاعری کا رنگ مشکل پسندی سے موسوم تھا اور کامل استادانہ شان ہی یہ تھی کہ مشکل سے مشکل زمین میں دوراز کار مضامین کو باندھا جائے جس سے سامعین پر رعب پڑے اور ایسا ہی ہوتا تھا۔لیکن اگر شعر میں احساس کی شدت کا ذکر کیا جائے جو اس دور میں بہت کم شعرا کے کلام میں تھی تو اس میں ظفر کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ان کی شاعری میں جذبات،اور احساس کی شدّت پورے شباب پر ہے اور وہ اسے بیان کرنے میں کبھی بھی پس وپیش نہیں کرتے بلکہ جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ میں ایک مشتِ غبار ہوں

میرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

سوزِ غمِ فراق سے دل اس طرح جلا
پھر ہو سکا کسی سے نہ ٹھنڈا کسی طرح

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ غم کہہ نہیں سکتے
پر جو شبِ غم ہے وہ ہم کہہ نہیں سکتے
آج تک معلوم یہ مجھکو نہیں کیا چیز ہوں
کون ہوں کیا شئے ہوں میں ناچیز ہوں یا چیز ہوں
اے ظفر کیا پوچھتے ہو کیا بتاؤں آپ کو
خاک ہوں میں خاک ہو ناکارہ ہوں ناچیز ہوں
لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں
کسی کی بنی ہے عالمِ نا پائدار میں

مندرجہ بالا اشعار میں غزل کا جو رنگ ہے یقیناً جدید ہے اور اپنے عہد کے عام رنگ سے ہٹ کر ہے حالانکہ سیاست اور معاشرے کی زبوں حالی کا ذکر کرنے کے لیے عہد ظفر میں ایک مایہ ناز صنف شہر آشوب موجود تھی اور اکثر شعرا اس صنف میں طبع آزمائی بھی کر رہے تھے لیکن ظفر نے اس صنف کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور غزل کے اشعار میں ہی وہ تمام کرب وحزن یکجا کر دیے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے:

''شاعری ادب ہے جو عام طور سے انسان سے گہرا اور اعلیٰ علاقہ رکھتا ہے۔ انسانی دلچسپی کے جز کے علاوہ اس میں جمالی دلچسپی بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے کیونکہ ان لوگوں میں جن میں تفکر کا ذریعہ ایسی زبان ہے جس میں شعر لکھا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ جمالی حسن کے ایسے نفیس سانچے تیار ہو جاتے ہیں کہ خیالات کو حسن کارانہ رنگ عطا کر کے پڑھنے والوں کے قلوب کو متاثر کر سکتے ہیں۔''

(ایم.ایچ لڈل۔مقدمہ: سائنٹفک اسٹڈی آف پوئٹری)

ظفر کے یہاں جمالیاتی احساس کی فراوانی ہے حالانکہ وہ دور افراتفری کا ہے لیکن بادشاہ بہر حال بادشاہ ہے لہٰذا ان کی شاعری کا بڑا حصّہ ان کے قلبی اور ذہنی واردات کا آئنہ ہے جس میں انھوں نے جسمانی اختلاط سے لے کر ذہنی آسودگی تک کے موضوعات کو شعری نزاکتوں کے ساتھ برت دیا ہے۔

جام ہے، شیشہ ہے، ساقی بھی ہے برسات بھی ہے

ان دنوں بادہ کشی دن بھی ہے اور رات بھی ہے
جوش مستی بھی ہے ہنگامِ ہم آغوشی بھی
خواہشِ وصل بھی ہے جائے ملاقات بھی ہے
وہ بھی سرمست ہے اور ہم بھی نشہ میں سرشار
ہاتھ گردن میں ہے اور لطف و عنایات بھی ہے
یار ہے یار کے ہے ساتھ ظفر بوس و کنار
اور اگر چاہیے کچھ بات تو وہ بات بھی ہے

جب انسان حالات کی چکّی میں بری طرح پس جاتا ہے اور اس سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تو وہ ذہنی طور پر ہی سہی اس کیفیت یا اس جبر سے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ اسی میں نفسانی جذبات اس کے کام آتے ہیں اور وہ اس نشے میں مدہوش ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

بزرگوں نے تو یہ بھی کہا ہے کہ جب کوئی معاشرہ زوال پذیر ہوتا ہے تو وہاں شعر و شاعری نیز فنونِ لطیفہ تیزی سے پروان چڑھتا ہے۔ اگر اس رائے کی روشنی میں ہم عہد ظفر کو دیکھیں تو اس قول کی صداقت صد فی صد درست ثابت ہوتی ہے کہ جہاں عہد ظفر کے پہلے سے ہی مغلیہ حکومت نام کو رہ گئی تھی اور پوری ہندوستانی تہذیب انگریزوں کے زیر اثر آ چکی تھی ہر شعبۂ زندگی میں اضمحلال کی کیفیت تھی لیکن اردو ادب بالخصوص شاعری کے لیے یہ سنہرا دور تھا۔ اور ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب نے اس دور میں جو نشانِ منزل مقرر کیے آج بھی ہم اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظفر کی شاعری میں منظر نگاری کا بھی حسنِ امتزاج ہے اور اس سلسلے میں بھی ان کے قوتِ متخیلہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں۔

''ایسے مواقع پر ظفر کی طبیعت طرفہ تماشائی بنی نظر آتی ہے اور یہاں بات تماشہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ظفر اس خوبصورت موقع پر اپنی طبیعت کی خوشیوں اور چہل بازیوں کا ذکر کرنے میں بھی تکلف نہیں کرتے۔ اس طرح کے شعروں میں زندگی کی جو لہر آگے بڑھتی اور رگ رگ میں پھیلتی محسوس ہوتی ہے اس کی لفظی تصویر پیش کرنے میں ظفر کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہے اور اس کا یہ تعلق زندگی

سے بہت قریب کا معلوم ہوتا ہے۔'' (ذوق سوانح اور انتقاد ص:42)

کنارِ آب ہو، مہتاب ہو، ساغر ہو، مینا ہو
جو یہ سامانِ کل ہوں پھر تو چہلیں ہوں، تماشہ ہو
ہم سے شرماؤ نہ تم چشم حیا کو کھولو
مثلِ گل شوق سے اب بندِ قبا کو کھولو
شمشیر برہنہ مانگ غضب آنکھوں کی چمک پھر ویسی ہے
جوڑے کی گندھاوٹ قہرِ خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہے

تادرِ جاناں ہمیں اول تو جانا منع ہے
اور گئے تو حلقۂ در کا ہلانا منع ہے
حلقۂ در گر ہلایا بھی تو بولے کون ہے
اب بتائیں کیا کہ نام اپنا بتانا منع ہے
غل مچا کر گر پکارا بھی تو جھنجھلا کر کہا
جاؤ کیوں آئے تمھیں گھر میں بلانا منع ہے

ظفر کے یہ اشعار ان کے ذاتی محسوسات سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن ذاتی محسوسات و تجربات کو شعر کا قالب عطا کرنا ان کا کمال ہے۔ ایسے مواقع پر ان کی شاعری میں لفظیات کی دنیا ایک خاص قسم کی بے ساختگی کو پروان چڑھاتی ہے اور یہی بے ساختگی ان کی شاعری کا حسن ہے۔ اس سلسلے میں عشرت جہاں ہاشمی رقم طراز ہیں:

''ظفر کی شاعری جن ذہنی امور اور حیاتِ گذراں کے جن کوائف کو پیش کرتے ہیں وہ ایک شہزادہ کی زندگی سے بہت قریب ہے۔ ٹھیک ہے کہ دوسروں کو بھی یہ مواقع ملتے ہیں لیکن عیشِ امروز کا یہ تصور اور آغوشِ انبساط سے لطف لینے کا یہ انداز، مسرور ہونے کی یہ خواہش اور کامیاب ہونے کی یہ خوشی سب کا حصّہ

نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص اس کا شاعرانہ بیان''

ظفر کے عہد میں تصوف کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور وہ خود بھی ''میاں کالے صاحب'' کے خاندان میں بیت تھے اور خود بھی دوسروں کو مرید کرتے تھے اسی لیے ان کو پیر و مرشد بھی کہا جاتا تھا۔ حالانکہ ان کی شاعری میں غالب رنگ تصوف کا نہیں لیکن چیدہ چیدہ اشعار اس امر کی چغلی کھاتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کورے نہ تھے۔

میری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

نہ وہ زمیں کے نہ ہے آسماں کے پردے میں
مگر ہے جلوہ نما دو جہاں کے پردے میں
دوئی کا پردہ اٹھا دل سے اور آنکھ سے دیکھ
خدا کے نور کو حسنِ بتاں کے پردے میں

ڈاکٹر اسلم پرویز نے ظفر کے سلسلے میں جو باتیں کی ہیں اس میں انھوں نے ظفر کے چار اہم رنگ کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

''اول وہ کلام جس میں محض فنّی مہارت بہم پہنچائی ہے اور قادرالکلامی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دوم وہ کلام جس میں گیت نما غزلیں قوالیاں ٹھمریاں اور مخمس وغیرہ ہیں سوم وہ کلام ہے جس میں مذہبی اور تصوفانہ اشعار ملتے ہیں جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ذہن پر مذہب اور تصوف کا گہرا اثر ہے، چہارم وہ کلام جن میں ان کی انفرادیت نمایاں اور فن کاری کارفرما ہے۔''

اسلم پرویز کی رائے سے اختلاف کی گنجائش یوں بھی نہیں کہ انھوں نے ظفر پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے لیکن عام طور پر ظفر کی شاعری کا مخصوص رنگ ان کی شاعری میں موجود عشق و حسن کا تصور ہے جس کی جدیں معاملہ بندی سے جا ملتی ہیں لیکن مجھے بار بار یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ ساری معاملہ بندی ان کا وہ فرار ہے جو وہ اپنے مسائل سے کرتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ پھر اپنے ہوش میں آتے ہیں اور حقائق سے

نظریں ملتی ہیں تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا
دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہا پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایا نہ بنایا ہوتا
روشِ گل میں کہاں یار ہنسانے والے
ہم کو شبنم کی طرح سب ہیں رلانے والے

یہ وہ رنگ ہے جس میں عہدِ بہادر شاہ کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے اور 1857 کی پہلی جنگ آزادی جسے ناکام جنگ آزادی کی ناکامی کا سارا کرب اس رنگ کے پس منظر میں صاف نظر آتا ہے۔

سرسید جس کے عینی شاہد ہیں۔ موصوف نے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کیا تھا اور 1857 کے انقلاب کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا۔ انہوں نے اسباب بغاوتِ ہند اور تاریخ سرکشی بجنور لکھ کر 1857ء کی تاریخ کو محفوظ کرلیا ہے۔ تقریباً 80 ہزار دستاویزات آج بھی اردو اور فارسی میں 1857ء کے واقعات موجود ہیں جن تک رسائی ہمارے لئے لازمی ہے۔ اردو اور فارسی کے بغیر 1857ء کے انقلاب کو سمجھنا مشکل امر ہے۔ میرے یہ مضمون جہاں ادبی تاریخ کے محققین اور طلباء کے لئے نئے مواد کی فراہمی کا وسیلہ ہے وہیں ہندو پاک کی جدید تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ بھی کرے گا۔ 1857ء کے انقلاب کی سب سے بڑی خصوصیت ہندو مسلم اتحاد تھا جو آج بھی اس ملک کی قومی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے یہ چند سطور اس ضرورت کی تکمیل میں سنگ میل کا حکم ثابت ہوگا۔

☆☆☆

راہی شہابی شخصیت اور سوانح

ڈاکٹر شیریں فاطمہ
کوٹہ (راجستھان)

ملخص

راہی کی ولادت ۲۲ رجنوری ۱۹۳۴ء کو قصبہ پہاسو ضلع بلند شہر یوپی میں ہوئی تھی۔ اپنی شاعری کے ذریعے انہوں نے اردو کو خاص و عام کے درمیان ہر دل عزیز بنانے کی پرزور کوشش کی۔ راہی کی پیدائش غلام ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اور ان کی جوانی ملک کے ناسازگار حالات میں پروان چڑھی۔ انہیں ملک کے بدلتے ہوئے حالات صاف نظر آرہے تھے۔ وطن دوستی کا جذبہ شروع سے ہی ان کے دل میں تھا۔ وطن دوستی کا رنگ ان کی شاعری میں صاف جھلکتا ہے۔ راہی شہابی نہ صرف راجستھان بلکہ ہندوستان کے برگزیدہ شعراء میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے بہاریہ نظموں میں حسن و عشق کا تذکرہ کیا ہے تو دوسری طرف قومی یکجہتی اور وطن پرستی سے متعلق نظمیں تخلیق کر کے اپنے سرگرمِ عمل شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

☆☆☆☆☆

اس مضمون میں راہی کی شخصیت اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کے آباء اجداد، پیدائش، تعلیم و تربیت، فکرِ معاش، ازدواجی زندگی، شعری زندگی کا آغاز، انعامات و اعزازات، عادات و خصائل وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

راہی نے میر وغالب کی شاعری سے بھی فیض اٹھایا، حالی وداغ کے خیالات، زبان اور اصلاح معاشرہ تفنن طبع سے بھی متاثر رہے۔ شعروادب کے آہنگ کی تبدیلیاں، اساتذہ واسلاف کی صحبت کا اثر اور معاصرین کے جملہ ہم نشین ہم سفری کے اثرات سماج کی تلخیوں میں ہم آہنگ کر کے راہی نے اپنی ایک منفرد پہچان بنائی اور اپنا ایک الگ مقام بنایا۔ راہی شہابی کی شخصیت مختلف الجہاد تھی۔ انہوں نے نثر ونظم میں یکساں طور پر تخلیقات پیش کر کے راجستھان کے اردو ادب میں جو اضافہ کیا وہ قابلِ تحسین ہے۔

سوانح تاریخ کی ایک شاخ ہے لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار ایک الگ صنف کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ سوانح انسان کی پیدائش، خاندان، تعلیم، مشاغل زندگی اور وفات کا بیان ہی نہیں بلکہ کسی فرد کے ظاہر اور باطن، عادات واطوار، اخلاق ومعاشرت، نفسیاتی کیفیت اور اس کی زندگی کے نشیب وفراز کی داستان ہے۔

اردو اپنے بال وپر سنوارتے ہی سرسید کے عہد میں اس قابل ہوگئی کہ سوانح جیسی مشکل چیز کو اردو میں فن کی حیثیت سے برتا جانے لگا۔ جبکہ عربی اور فارسی جیسی زبانوں میں بھی فنی معیار کے مطابق اعلیٰ اور کامل سوانح عمریاں نہیں ملتی۔ اردو میں سوانح نگاری کے عناصر تو ابتدا ہی سے نظم ونثر میں شامل رہے ہیں۔ سوانح نگاری کی ابتدا دکن میں ہوئی وہاں کی مثنویوں میں سوانح کے اولین نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ نصرتی نے اپنے والد مربی علمی عادل شاہ اور دیگر شخصیتوں کی سیرت وسوانح نہایت عمدگی سے بیان کی ہے۔ ان کے علاوہ رومی، ذوقی اور دیگر مثنوی نگاروں نے بھی اس طرف توجہ کی ہے۔

اس کے بعد شعراء اردو کے تذکروں کا دور شروع ہوتا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے بے حد اختصار سے کام لیا ہے۔ اکثر نے تو شاعر کا نام یا تخلص لکھا اور نمونے کے طور پر ایک شعر پیش کر دیا۔ سیرت وسوانح نگاری کو وہ اپنی ذمہ داری خیال نہیں کرتے تھے۔

محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' اردو شاعروں کا تذکرہ بھی ہے اور اردو ادب کی تاریخ بھی۔ لیکن ان دونوں سے زیادہ اس کی ایک اور اہم خصوصیت ہے کہ انہوں نے بہت سی ادبی شخصیتوں کی سیرت وسوانح بھی پیش کی ہے۔

آزاد کے زمانے میں ہندوستان انگریزی تسلط میں چلا گیا تھا اور ہمارے بزرگ ادیب انگریزیادب کے نمونوں سے متاثر ہورہے تھے۔ان بزرگوں میں مولانا حالی اور علامہ شبلی دوایسی شخصیت میں جنہوں نے انگریزی نہ جاننے کے باوجود انگریزی ادب کے نمونوں سے شناسائی حاصل کی اور تصانیف سے اردوادب کا دامن وسیع کیا۔ان دونوں نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی۔اردو میں حالی کی تین سوانح تصانیف ''حیاتِ سعدی''،''حیاتِ جاوید''، اور ''یادگارِ غالب''اور شبلی کی ''المامون''، ''سیرۃ النعمان''، ''الفاروق''،''الغزالی''، ''سوانح مولانا روم''اور''سیرۃ النبیؐ''ہیں۔جن سے اردوادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔

سوانح نگاری کی تعریف وتجدید بظاہر نہایت جامع او مانع ہے۔مگر ایک ایسی شخصیت کی سوانح قلم بند کرنا جو بیک وقت انسان اور شاعر ہو اور جس کی زندگی متضاد واقعات، ہنگامہ آرا کارنامے، اقتصادی سرگرمیاں، سماجی خدمات، سرکاری ملازمت اور مذہبی ہنگامے رہے ہوں تو ان کو ترتیب کے ساتھ مدون کرکے ان کی حالاتِ زندگی لکھنا ذرا مشکل ہے۔سوانح نگار اور شخصیت کے درمیان فاصلے حائل ہوتو یہ منزل اور بھی مشکل اور دشوار ہوجاتی ہے۔

شاعر کے افکار وخیالات، جذبات واحساسات، افعال اور اعمال اور سیرت وکردار سب کچھ شاعرانہ ہوتے ہیں۔وہ دنیا کی ہر شئے میں شعریت محسوس کرتا ہے۔لیکن یہاں ہم جس شخصیت کا مطالعہ کرنے جارہے ہیں وہ ایک کامیاب شاعر، نثر نگار اور عیب مشق سخن کے خوبصورت امتزاج کی حامل شخصیت ہے۔

میرے والد محترم جناب رضاءالحق صاحب کے راہی صاحب سے دوستانہ تعلق تھا۔وہ راہی صاحب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ

> ''راہی صاحب کا پورا نام نفاست علی خاں راہی شہابی تھا۔وہ جناب کنور یاسین علی خاں عرف شہاب برنی صاحب کے بیٹے تھے۔راہی صاحب سے میری ملاقات جب ہوئی جب میں حکمت پڑھنے کے لئے جے پور گیا تو حکیم سلیم الدین صاحب کی حویلی''سلیم منزل''میں یونانی آیورویدک کالج تھا۔ کالج کے پرنسپل جناب حکیم سلیم الدین صاحب تھے۔وہاں نفاست علی

صاحب اپنے والد جناب کنور یاسین علی خاں صاحب اور دو چھوٹے بھائی جناب فصاحت علی خاں اور جناب شجاعت علی خاں کے ساتھ رہتے تھے۔ میں بھی وہیں رہتا تھا۔ ان کی شادی راؤ عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ کوٹہ کے میلا دشہرہ کے مشاعروں میں وہ کئی بار تشریف لائے۔ ان کے بہترین اشعار مجھے آج بھی زبانی یاد ہیں۔'' (۱)

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

گل فروش عظمت دار رسن خطرے میں ہے
سرمدوں اٹھو کہ تاریخ کوہن خطرے میں ہے
کل ہم پر یہ الزام مت دینا نگاہ بانو کہ ہم
آج ہی بتلاتے ہیں کہ سارا چمن خطرے میں ہے

راہی صاحب نے یہ نظم سن ۱۹۶۳ء میں مسلم مسافر خانہ کی ایک مجلس میں پڑھی۔ جس کی صدارت جناب الطاف حسین خیری نے کی تھی۔ ان کی یہ نظم رسالہ پاکستان (جام نور) میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

حسن کو زندہ جاوید بنا دیتا ہے
عشق برباد بھی ہو جاتے تو برباد نہیں
کچھ نہ کچھ عہد تو تم نے بھی کئے تھے ہم سے
اب یہ اور بات ہے کہ وہ عہد تمہیں یاد نہیں

''راہی صاحب نے یہ نظم نواب مکرم علی خاں صاحب کی سالگرہ پر ممتاز باغ ایم۔آئی۔ روڈ جے پور کے مشاعرے میں پڑھی تھی''۔

۱۔ ولادت:

راہی شہابی کا اصل اور پورا نام کنور نفاست علی خاں تھا۔ راہی شہابی تخلص کرتے تھے۔ پہلے راہی بلند شہری تخلص استعمال کرتے تھے، بعد میں والد صاحب کی نسبت سے راہی شہابی ہو گئے۔ راہی شہابی ادیب الملک کنور یٰسین علی خاں شہاب کے بیٹے تھے۔ راہی شہابی کی

۲۲؍جنوری ۱۹۳۴ء قصبہ پہاسو ضلع بلند شہر یوپی میں ولادت ہوئی۔ کنور یٰسین علی خاں کے گھر بیٹے کی ولادت پر والد کنور تحسین علی خاں (آخری گورنر جے پور ریاست) اپنی ڈائری میں اپنی خوشی کو یوں ظاہر کرتے ہیں:

''آج میرے یہاں پوتا ہوا ہے۔ میرے ایسے نصیب و مقدر کہاں کہ پوتا دیکھوں اللہ نے اپنے فضل سے مجھے پوتا دکھایا''۔(۲)

راہی شہابی کی ولادت کے متعلق چند اختلافات:

۱۔ راہی شہابی کی پیدائش ۲۲؍جنوری ۱۹۳۷ء میں بلند شہر یوپی میں ہوئی۔

۲۔ راہی شہابی کی پیدائش ۲۲ جنوری ۱۹۳۴ء میں بلند شہر یوپی میں ہوئی۔

۳۔ کنور محمد نفاست علی خاں راہی شہابی ۲۲؍جنوری ۱۹۳۴ء میں جے پور میں پیدا ہوئے۔

۴۔ راہی شہابی ۱۹۳۴ء میں جے پور میں پیدا ہوئے۔

۵۔ راہی شہابی ۳۰؍جنوری ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے۔

تحقیق کے دوران راہی شہابی کی پیدائش کے متعلق یہ چند اختلافات میری نظروں کے سامنے آئے۔ میں نے ان اختلافات کی تصدیق راہی شہابی کے صاحبزادے جناب وجاہت علی خاں شہابی سے کی علاوہ ازیں ''جانِ غالب کا راہی شہابی نمبر'' میں شامل مضمون ''راہی شہابی کی کہانی خود کی زبانی'' سے حاصل ہوئی۔ راہی شہابی کی صحیح پیدائش ۲۲؍جنوری ۱۹۳۴ء قصبہ پہاسو ضلع بلند شہر یوپی ہے۔ اب راہی کی پیدائش کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ اباء واجداد:

راہی شہابی کے بزرگ راجپوت تھے۔ مغلیہ دور میں علاقہ قرولی کے ایک راجا لال سنگھ نے اسلام قبول کرلیا اور مسلمان ہوگئے انہوں نے شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا اور لال خاں کے نام سے مشہور ہوئے غدر کے زمانے میں راہی صاحب کے بزرگوں نے انگریزوں کی مخالفت کی اور جنگ آزادی میں حرّیت پسندوں کا ساتھ دیا۔ مہاراجا جے پور رام سنگھ کی دعوت پر سن ۱۸۴۳ء میں یہ خاندان ریاست جے پور میں آکر بس گیا۔ مہاراجا رام سنگھ نے اس خاندان کی خوب پذیرائی کی۔ انہیں اعلیٰ عہدوں سے نوازہ۔ راہی صاحب کے پردادا

نواب فیاض علی خاں ریاست جے پور کے وزیر اعلیٰ رہے۔اوران کے دادا کنور تحسین علی خاں صاحب ریاست کے سپہ سالار تھے۔

بقول راہی صاحب کے چھوٹے بھائی کنور فصاحت علی خاں:۔

''۱۸۴۳ء میں جے پور ریاست کے مہاراجا رام سنگھ کی دعوت پر ہمارے بزرگ جے پور میں آ کر بس گئے۔نواب فیض علی خاں جے پور ریاست کے وزیر اعظم بنائے گئے اور کنور امداد علی خاں فوج بخشی (فوج کے کمانڈر آف چیف) بنائے گئے یہ حقیقی بھائی تھے اوران کے والد جناب مردان علی خاں تھے۔کنور امداد علی خاں کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے کنور سرور علی خاں فوج بخشی بنائے گئے اور یہ سلسلہ نسل در نسل ۱۹۴۰ء تک چلتا رہا۔اور کنور سرور علی خاں کے بعد میرے دادا حضور کنور تحسین علی خاں کو بخشی فوج بنایا گیا۔جو کی جے پور ریاست کے آخری گورنر تھے۔ان کے بعد میرے والد بزرگ وار نے اردو ادب کو اپنا میدان عمل بنایا۔

نواب فیض علی خاں کے بیٹے نواب فیاض علی خاں تھے اور ان کے بیٹے نواب مکرم علی خاں تھے۔جو اردو ادب میں اعلیٰ درجے کے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔آج بھی جے پور کے ترپولیہ مارکیٹ میں ان کی حویلی موجود ہے۔نواب فیض علی خاں جناب مسکین شاہ صاحب کے مرید تھے حضرت مسکین شاہ صاحب کی درگاہ کی موجودہ عمارت نواب فیض علی خاں نے ہی بنوائی تھی''(۳)

نواب فیض علی خاں اور کنور امداد علی خاں حقیقی بھائی تھے۔۱۸۶۴ء میں پنڈت شیو دین کے فوت ہو جانے پر جے پور ریاست کے مہاراجا رام سنگھ نے نواب فیض علی خاں کو اپنا مصاحب بنا کر ریاست کی فوج کا کمانڈر (بخشی فوج) مقرر کر دیا۔اور تمام اختیارات نواب صاحب کو عطا کئے۔یہ واقعہ کئی تاریخی کتب میں درج ہے۔جیسے کارنامہ راجپوتاں، مولوی نجم الغنی ،صفحہ نمبر۔۳۲۹۔اور وقائع راجپوتانہ، جوالہ سہائے ،صفحہ نمبر ۹۷،جلد دوم اور اے ہسٹری آف جے

پور، جادو ناتھ سرکار صفحہ نمبر ۳۵۱، وغیرہ ﴾ میں درج ہے۔ ایسا بھی کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران مہاراجا جے پور نے ڈھائی ہزار کی جو فوج شہر کی حفاظت کے لئے رکھوائی تھی اور چھ ہزار فوج پولیٹیکل افسر کے ہمراہ کی تھی جو گڑگاؤں کی طرف سے بہت سے انگریزوں کو امن کے ساتھ آگرہ کے قلعہ تک پہنچا آئی تھی اس میں کنور امداد علی سپہ سالار کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ واقعہ بھی مندرجہ بالا کتابوں میں لکھا ہے۔لیکن امداد علی کے نام کی وضاحت نہیں ہے۔ ۱۸۷۱ء میں نواب فیض محمد خاں کو انگریزی سرکار سے ممتاز الدولہ کا خطاب اور سی، ایس، آئی کا تمغہ عطا ہوا۔

دو سال بعد فریضہ حج نواب صاحب نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔لیکن اسی دوران ریاست کوٹہ میں حالات خراب ہوگئے مہاراج کوٹہ نے انگریز حکومت سے مدد مانگی۔تب انگریزی حکومت نے نواب فیض محمد علی خاں کو ریاست کوٹہ کا مدادالمہام بنا دیا۔ جہاں اپنی قابلیت کے دم پر نواب صاحب نے حالات کو درست کیا۔

راہی شہابی کے دادا کنور تحسین علی خاں کے دو نکاح ہوئے تھے۔ان کی پہلی بیوی کے بطن سے ایک لڑکی اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ صاحبزادی شمس النساء اور صاحبزادے کنور یٰسین علی خاں اور کنور تسکین علی خاں صاحب۔ ۱۹۹۰ء میں کنور تسکین علی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ وہ حضرت مسکین شاہ صاحب کی درگاہ میں دفنائے گئے۔کنور تسکین علی خاں صاحب کے دو لڑکے ہوئے۔کنور تنویر علی خاں اور کنور جاوید علی خاں۔ کنور تنویر علی خاں کا تالاب میں ڈوبنے سے انتقال ہو گیا تھا۔انہیں علی گڑھ میں دفنایا گیا۔اور کنور جاوید علی خاں دہلی میں آباد ہیں۔

کنور تحسین علی خاں کی دوسری بیوی سے دو بیٹے ہوئے تھے۔کنور تزئین علی خاں اور کنور تظمین علی خاں۔کنور تزئین علی خاں کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئے۔ان کی بیٹی اور بیٹا کنور شعیب علی خاں رائے پور ضلع سہارن پور میں رہتے ہیں۔کنور تزئین علی خاں کا انتقال ۱۹۸۰ء میں علی گڑھ (یو پی) میں ہوا۔کنور تظمین علی خاں شاعر تھے اور قمر تخلص کرتے تھے۔ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔۲۵ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔

کنور یٰسین علی خاں کی بیوی یعنی راہی صاحب کی والدہ کا نام فاروقہ بیگم تھا۔ وہ

سہارنپور کی تھیں ۔ وہ ایک زمیندار کی بیٹی تھی ۔ فاروقہ بیگم کو دِق (ٹی ۔ بی) کی بیماری تھی ۔ دوسال اس مرض میں مبتلا رہیں اور چالیس برس کی عمر میں ، ۲۹ ۔ اپریل ۱۹۵۲ء کو ان کا انتقال ہوگیا ۔ ان کو علی گڑھ میں دفنایا گیا ۔ فاروقہ بیگم ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں ۔ نماز روزے کی پابند اور عبادت گزار خاتون تھیں شعر پڑھنے کا اور سننے کا شوق رکھتی تھیں ۔ اکثر نعتیہ اشعار گنگنایا کرتی تھیں ۔

راہی شہابی کے والد کنور یٰسین علی خاں شہاب جن کو ادبی دنیا میں ادیب الملک کے خطاب سے جانا جاتا ہے ۔ اپنے دور کے بہترین انشاء پرداز ، مضمون نگار افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار تھے ۔ ان کا پورا نام محمد یٰسین علی خاں تھا اور شہاب تخلص کرتے تھے ۔ وہ ۲۰ ر دسمبر ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جے پور میں گزارا ۔ انہوں نے انگریزی کی تعلیم دہرہ دون سے اور عربی فارسی کی تعلیم بھوپال سے حاصل کی ۔ وہ شاعر بھی تھے لیکن ان کا زیادہ رجحان نثر کی طرف تھا ۔ انہوں نے بہت سے افسانے مضامین اور ناول لکھے لیکن انہوں نے ڈرامہ نگاری کو خاص توجہ دی اور اسی میدان میں اپنی قلم کا جوہر دکھایا ۔ انہیں اپنے ڈراموں کی بدولت خوب شہرت حاصل ہوئی ۔ ان کے مشہور ڈراموں میں رستم وسہراب ، شیطان ، معرکہ ، خیروشر ، امتحان ، وعدہ ، حلقہ زہرومشتری اور اشرف المخلوقات بہت مشہور ہوئے ۔

یٰسین علی خاں صاحب جے پور سے نکلنے والے رسالے ، ''شادماں'' ، سے وابستہ تھے ۔ جس کے مدیر حکیم نورالحسن تھے ۔ اس رسالے میں شہاب صاحب کے کئی طویل اور مختصر افسانے شائع ہوئے تھے ۔ شہاب بمبئی سے نکلنے والے اخبار ''خلافت'' کے بھی ایڈیٹر رہے بمبئی کی پارسی تھیٹر یکل کمپنی اور الفریڈ تھیٹر یکل کمپنی کے لئے بھی شہاب صاحب نے کئی ڈرامے لکھے شہاب صاحب آگرہ سے نکلنے والے ''اخلاق'' کے بھی ایڈیٹر رہے ۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ شہاب صاحب کو صحافت سے کتنی دلچسپی تھی ۔

شاہد احمد جمالی صاحب کی تصنیف کے مطابق ، شہاب صاحب کے ہم عصروں میں سیماب اکبرآبادی ، میکش اکبرآبادی ، اطہر ہاپوڑی ، مولانا امیر حسن سہا ، آغا حشر کاشمیری ، انور صابری ، بسمل سعیدی ، نشتر بلگرامی ، ناظم عزیزی ، مولانا قمر واحدی ، رضی الدین رضا بے پر ، حافظ

منظور ادیب، مختار الرحمٰن راہیؔ ، پارسا کوثری، لال صباؔ، تقی حسین پیامؔ، خداداد خاں مونسؔ، مولانا سید نظیر حسن سخاؔ، حکیم سید القادر ماہرؔ، ستارجے پوری وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان سب میں آغا حشر کاشمیری شہابؔ صاحب کے خاص دوست تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شہابؔ صاحب کے ڈراموں میں آغا حشر کاشمیری کا رنگ جھلکتا ہے۔

شہابؔ صاحب نے زندگی کا بیشتر حصہ اردو ادب کی خدمت میں گزارہ ہے اور اپنی بہترین تخلیقات سے اردو زبان و ادب میں اضافہ کیا ہے۔

راجستھان میں اردو ڈرامہ نگاری اور افسانوی ادب کو فروغ دینے والی اس ہستی نے ۳۰ جولائی ۱۹۷۵ء میں انتقال فرمایا۔

کنور یٰسین علی خاں شہابؔ کے چار اولادیں ہویں تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ راہیؔ شہابی سب سے بڑے بیٹے تھے منجھلے بیٹے کنور فصاحت علی خاں جو اب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آج بھی جے پور میں مقیم ہیں۔ شہابؔ صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے شجاعت علی خاں تھے، ایک مہلک بیماری کی وجہ سے ۱۹۶۴ء میں محض ۲۴ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کو حضرت مسکین شاہ صاحب کی درگاہ کے قبرستان میں ہی دفنایا گیا۔ شہابؔ صاحب کے سلطانہ نام کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا چیچک کی بیماری کی وجہ سے بچپن میں ہی ان کی والدہ کے چلے جانے کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔ انہیں بھی ان کی والدہ کے قریب علی گڑھ میں دفنایا گیا۔

۳. تعلیم وتربیت

راہیؔ شہابی کی ابتدائی تعلیم اور تربیت گھر ہی پر ہوئی ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی کی تعلیم اپنے والد محترم جناب یٰسین علی خاں شہابؔ سے حاصل کی۔ اور آگے کی تعلیم کے لئے انہیں علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے علی گڑھ میٹرو سرکل ہائی اسکول میں داخلہ لیا ۱۹۵۴ء میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔اے۔ میں انگریزی اردو فارسی، تاریخ اور نفسیات ان کے مضامین میں شامل تھے۔

راہیؔ شہابی تہذیبی ماحول اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے بزرگ

اپنے زمانے کے تعلیم یافتہ اور قابل لوگ تھے یہاں تک کہ ان کے والد خود اپنے زمانے کے مشہور ادیب اور شاعر رہے ہیں راہیؔ شہابی کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد نے اہم رول ادا کیا ہے۔

بقول مخمورؔ سعیدی:

'ملک کے نامور اور جلیل القدر ادیب حضرت شہابؔ برنی ان کے والد تھے ایک عالم باپ کے آغوش میں ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ شاعری اور نثر نگاری ان کو وراثت میں حاصل ہوئی، انہوں نے نظم اور نثر دونوں ہی میدانوں میں جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں بی۔ اے، تک تعلیم پائی اور اردو فارسی اپنے والد صاحب مرحوم سے پڑھی اپنے کلام پر اصلاح بھی انہیں سے لی اس لئے وہ اپنے تخلص کے ساتھ شہابؔی لکھتے ہیں۔'' (۴)

مخمورؔ صاحب کے مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے راہیؔ شہابی کی تعلیم و تربیت کے لئے زمین پہلے سے ہی ہموار کر دی تھی۔

۴. عادات و خصائل:-

راہیؔ شہابی کی زندگی سادگی قناعت اور خلوص و محبت کا مرقع تھی۔ انہوں نے بہت شہرت حاصل کی لیکن ان کی روش میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا خلوص و محبت سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ عزیز و اقارب، دوست احباب اور ملک و ملت سبھی کے لئے ان کے دل میں بے پناہ محبت تھی۔ مرتے دم تک ایثار ان کا شیوہ رہا۔

راہیؔ شہابی ایک سادہ مزاج انسان تھے بناوٹی پن ان کو بالکل پسند نہیں تھا۔ سادہ لباس انہیں ہمیشہ عزیز رہا۔ گھر میں عموماً کرتا پائے جامہ پہننا پسند کرتے تھے۔ گھر سے باہر زیادہ تر سفاری سوٹ اور پینٹ شرٹ پہنا کرتے تھے۔ بقول انوار فاطمہ (اہلیہ راہیؔ شہابی)

''لباس کے معاملے میں بہت سادگی پسند تھے۔ وضع قطع کے اعتبار سے ان کا قد درمیانہ تھا۔ آنکھیں روشن اور پیشانی کشادہ تھی۔ آنکھوں پر بینائی کا

چشمہ ہوتا تھا ۔ بال لمبے لمبے تھے جو اکثر پیچھے کی طرف پڑے رہتے تھے طرزِ گفتگو بڑا گھن گرج والا اور رعب دارانہ اپنی بات کو بڑے صاف اور وزن دار طریقے سے کہتے تھے ۔ (۵)

اسی زمرے میں جناب نسیم الدین خاں پیارے میاں یوں رقم طراز ہیں ۔

''ہم ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح تھے ۔ اور میں ان کا بے حد احترام کرتا تھا ۔ اور وہ مجھ سے بہت محبت، شفقت واپنائیت کا برتاؤ کرتے تھے ۔ یہ سلسلہ انکی وفات تک قائم رہا ۔ ربّ کریم ان کی قبر کو روشن فرمائے کہ ان کے بعد بھی ان کی یادیں اور باتیں میرے ذہن و دماغ میں بسی ہوئی ہیں اور یقیناً میرا قیمتی سرمایہ ہے ۔ میں نے راہی صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ وہ درحقیقت مشرقی اقدار کے وضعدار اور شریف النفس آدمی تھے ۔ اب اس وضع قطع کے لوگوں سے سوسائٹی خالی ہوتی جارہی ہے ۔ اس مشینی اور تجارتی دور نے سبھی قدروں کو پائمال کردیا ہے ۔ وہ جس مزاج کے آدمی تھے اس میں تعلقات دائمی ہوتے تھے ۔ وہ مجھ سے تعلقات نبھاتے رہے اور مجھ پر ان کی شفقت ہمیشہ برقرار رہی'' ۔ (۶)

۵. شعر گوئی کا آغاز:

راہیؔ شہابی کو بچپن سے ہی اپنے گھر میں شعر و شاعری کا ماحول ملا ۔ ان کے والد کنور یٰسین علی خان شہابؔ برنی خود بہت اچھے شاعر تھے ۔ اس لئے ان میں بھی شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوگیا ۔ کلام پر اصلاح بھی وہ اپنے والد محترم سے لیا کرتے تھے ۔ راہیؔ شہابی نے اپنے والد کے علاوہ باقاعدہ کبھی کسی استاد کی شاگردگی اختیار نہیں کی ۔ حالانکہ کبھی کبھی وہ جناب بسملؔ سعیدی سے کلام پر اصلاح لے لیا کرتے تھے ۔ ان کی ابتدائی شاعری پر اخترؔ شیرانی کے اثرات نظر آتے ہیں ۔

راہیؔ شہابی کی پہلی نظم ''پیغام'' ہے جو ۱۹۵۲ء ماہنامہ بیسویں صدی میں شائع ہوئی تھی ۔ انہوں نے اپنا پہلا مشاعرہ ۱۹۵۴ء میں دہلی میں ''یومِ اقبال'' کے سلسلے میں پڑھا تھا ۔ اس مشاعرے میں ان کا ایک شعر بہت مقبول ہوا تھا ۔

حوادث کو نہیں معلوم شاید
سفینہ میرا طوفاں میں پلا ہے

جے پور میں ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۶۰ء سے ہوا۔ راہیؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو کو عوام کے درمیان ہر دل عزیز بنانے کی پرزور کوشش کی ہے۔ ابتدا میں راہیؔ نے غزلیں بھی لکھی اور نظمیں بھی لیکن ان کی دلچسپی نظموں میں زیادہ تھی۔ اس لئے ان کی توجہ بھی زیادہ نظموں پر رہی۔ اپنی نظموں کے ذریعے انہوں نے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی اور عوام کے درمیان نظم کے شاعر کے روپ میں مقبول ہوئے۔

۶. شاعری میں وطن پرستی:

۱۹۳۴ء میں جب راہیؔ شہابی پیدا ہوئے تو سرزمین ہند انگریزوں کی غلامی کی بیڑیوں میں جکڑا تھا اور جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو ملک کے حالات کچھ اور تھے۔ ہندوستان انگریزوں سے تو آزاد ہو گیا تھا لیکن اسے تقسیمِ ہند کا درد سہنا پڑ رہا تھا۔ ملک پر آزادی کی روشنی کے ساتھ ساتھ رسوائیوں کی تاریکی بھی چھانے لگی تھی۔ یہ سب راہیؔ نے بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔ راہیؔ ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ انہیں ملک کے بدلتے ہوئے المناک حالات صاف نظر آرہے تھے۔ وطن سے محبت ان کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑتی تھی۔ وطن پرستی کا جو جذبہ ان میں تھا وہ ان کی شاعری میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ وطن پرستی اور وطن دوستی کا رنگ ان کی نظموں میں صاف جھلکتا ہے۔ اعلانِ وفا، اے وطن رخصت، برادرانِ وطنسے، کاروانِ آزادی، پریشاں ملے، جیسی نظمیں ان کی وطن پرستی کی نشانی ہے۔ ''اعلانِ وفا'' کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

درماندہ وپس ماندہ وفادار ہمیں ہیں
بدبخت ہیں بے یارو ومددگار ہمیں ہیں
بے جرم ہیں اس پر بھی خطا کار ہمیں ہیں
پیاسے ہیں مگر ابرِ گہربار ہمیں ہیں
دھندلے ہیں مگر گوہر شہوار ہمیں ہیں
ارے ارضِ وطن تیرے پرستار ہمیں ہیں

۷. فکرِ معاش:

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ راہیؔ شہابی کا تعلق جاگیردار خاندان سے تھا۔ اور ان کے بزرگ بڑی عالیشان اور پُرسکون زندگی گزارتے آرہے تھے۔ لیکن راہیؔ شہابی کے والد کنور یٰسین علی خاں، شہابؔ برنی کا زمانہ آتے آتے ساری شان وشوکت اور سکون پذیر زندگی تقریباً ختم ہو چلی تھی۔ راہیؔ شہابی کی زندگی میں جاگیرداران اور عالیشان زندگی کا فقدان تھا۔ راہیؔ شہابی کے ہوش سنبھالتے ہی انہیں فکرِ معاش ستانے لگی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے تلاشِ معاش جاری رکھی۔

۱۹۵۴ء میں ملازمت کے لئے راہیؔ شہابی ہفت روزہ ''جمہور'' علی گڑھ کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک ''روزنامہ نئی دنیا، دہلی'' روزنامہ پیغام ''کانپور، اور ہفت روزہ ''آوازِ وطن'' کانپور میں کام کیا۔ ۱۹۶۵ء میں جے پور میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۹۲ء میں ڈپٹی ڈائرکٹر پبلک ریلیشن کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے۔ راہیؔ شہابی دورانِ ملازت ڈپوٹیشن پر ۱۸/سال تک راجستھان کے پانچ وزرائے اعلیٰ کے پریس سیکریٹری رہے۔ ۱۹۹۳ء میں محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ راہیؔ شہابی کو ریٹائرمینٹ کے بعد حکومت نے راجستھان اردو اکادمی کا سکریٹری مقرر کردیا۔ پھر اردو اکادمی کے نائب صدر بنائے گئے اور اس کے بعد انہیں اکادمی کا صدر بنادیا گیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی صاحب یوں رقم طراز ہیں:

> ''علی گڑھ سے راہیؔ شہابی تلاشِ معاش میں دہلی پہنچے جہاں ۱۹۵۴ء میں ماہنامہ خاتونِ مشرق سے وابستہ ہوئے اسی دوران ۱۹۵۶ء میں روزنامہ نئی دنیا میں نیوز ریڈر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ۱۹۵۷ء میں روزنامہ اخبار پیغام کانپور اور پھر ۱۹۵۸ء میں ہفت روزہ آوازِ وطن کانپور کے مدیر بنے اور اس طرح اخبارات سے وابستہ رہتے ہوئے صحافت کے ساتھ نثر نگاری کا تجربہ بھی حاصل کرتے رہے۔ ان کا یہ تجربہ آگے چل کر انکی ملازمت میں بھی کام آیا۔ اس لئے کہ دہلی اور کانپور میں اخبارات سے وابستگی کے بعد وہ

جے پور آ گئے تھے۔ جہاں ان کے والد پہلے سے سکونت پذیر تھے۔ اور جے پور میں ان کو محکمہ واطلاعات وتعلقات عامہ میں ملازمت ملی جہاں ۲۸/سال تک ملازمت کی اور اپنی قابلیت کے باعث ترقی کرتے رہے اور ۱۹۹۳ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے سے پینشن یاب ہوئے۔ اس دوران تقریباً ۱۸/سال تک حکومت راجستھان کے پانچ وزرائے اعلیٰ کے پریس ایلچی بھی رہے۔ اور اس طرح ان کی ملازمت کسی نہ کسی نوعیت سے صحافت سے ہی وابستہ رہی'' (۷)

۸. ازدواجی زندگی

راہی شہابی کا نکاح گاؤں کھیڑی ضلع سہارن پور یوپی کے زمیندار جناب راؤ عبدالعزیز کی دختر محترمہ انوار فاطمہ کے ساتھ جون ۱۹۶۴ء کو ہوا۔ محترمہ انوار فاطمہ راہی صاحب کی خالہ کی صاحبزادی ہیں اور نواب مکرم علی خاں کی بھتیجی بھی ہیں۔ انوار صاحبہ ۶/ بھائی بہن ہیں۔ آپ کے خاندان کا شمار ہندوستان کے مشہور اور معروف خاندانوں میں ہوتا ہے۔ ان کے بڑے بھائی جناب راؤ عثمان علی خاں ڈسٹرک جج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اور ان سے چھوٹے بھائی بمبئی میں ریجنل مینجر کے عہدے پر فائز رہے۔ اور ان کے سب سے چھوٹے بھائی آج بھی پہاسو ہاؤس میں رہتے ہیں۔

محترمہ انوار فاطمہ کا کردار میری نظر میں بہت ہی خوبصورت اور روشن کردار ہے وہ پڑھی لکھی اور باشعور خاتون ہیں۔ ایک گھریلو عورت ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے گھر کے سبھی افراد کو محبت کی ڈور سے باندھے رکھا۔ اور کبھی اسے ٹوٹنے نہیں دیا۔ وقت کے خوفناک حادثوں اور راہی صاحب کی جدائی نے بھلے ہی انہیں اندر سے توڑ دیا۔ لیکن آج بھی وہ ہمت وحوصلے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس ہمت کو تا عمر برقرار رکھے اور ان کی عمر میں ہزار سالوں کی برکت عطا فرمائے۔

''۷/جولائی ۲۰۱۷ء کو جب میری ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو وہ بہت محبت اور عاجزی کے ساتھ مجھ سے ملی۔ اس وقت وہ پیر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے بہت پریشان تھیں لیکن ایسی

حالت میں بھی انہوں نے خدا کا ذکر کرنا نہیں چھوڑا او مجھے نماز پڑھتی ہوئی ملیں۔ نماز سے فارغ ہوکر انہوں نے بہت محبت کے ساتھ مجھ سے بات کی۔ محبت اور شفقت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری پی۔ ایچ ڈی جلد پوری ہو جائے اس واسطے مجھے خوب دعائیں دی۔

راہی شہابی کو خدا نے چار اولادیں عطا فرمائی۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ ان کے ایک بیٹے کا انتقال ایک سال کی عمر میں ہی ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ راہی شہابی کے بڑے بیٹے وجاہت علی خاں اور چھوٹے صباحت علی خاں اور سب سے چھوٹی بیٹی شگفتہ شہابی ہیں۔

راہی شہابی کے بڑے صاحبزادے جناب وجاہت علی خاں شہابی ایک باوقار اور باکردار شخصیت ہیں۔ اپنے والد کی طرح علم وادب سے محبت رکھتے ہیں۔ حالِ حاضر میں وہ سیکٹریٹ میں مائنورٹی کمیشن میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی شادی سہارنپور یوپی میں ہوئی۔ علم وادب کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے انہیں صحافت کا بہت شوق ہے اسی کے چلتے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے کئی اخبارات میں بھی کام کیا۔

راہی شہابی کے چھوٹے بیٹے جناب صباحت علی خاں بھی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ محض ۲۲ رسال کی عمر میں ایک کار حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کار حادثے میں راہی شہابی بھی خود بری طرح گھائل ہو گئے تھے یہاں تک کہ ان کو بیٹے کے انتقال کی خبر بھی نہیں دی گئی۔ بے بی شبانہ اپنے مقالے میں فرماتی ہیں کہ:

> ''وہ جب اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ایک تقریب میں شرکت کے لئے بذریعہ کار علی گڑھ جا رہے تھے، حادثے کا شکار ہو گئے جن میں خاندان کے تقریباً سبھی لوگ بُری طرح زخمی ہو گئے۔ راہی شہابی خود بُری طرح گھائل ہوئے اور انہیں بیٹے کے انتقال کی خبر بھی نہیں دی گئی۔ راہی شہابی کے کلام پر اس حادثے کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں''(۸)

صباحت علی خاں بھی اپنے بھائی اور والد کی طرح شفاف ذہن کے مالک تھے۔ بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ ان کو صحافت سے گہرہ لگاؤ تھا۔ جس وقت جہانِ فانی سے کوچ کیا اس وقت وہ جرنلزم کر رہے تھے۔ بقول محترمہ شگفتہ شہابی:

''صباحت بھائی بہت ہنرمند تھے۔ والد محترم کی ہی طرح بہت ذہین تھے۔ اور ہر میدان میں اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے تھے جس وقت دنیا سے گئے جنرلزم کر رہے تھے کیوں کہ صحافت کا انہیں بہت شوق تھا''۔(۹)

راہی شہابی کی سب سے چھوٹی اولاد ان کی اکلوتی صاحبزادی محترمہ شگفتہ شہابی ہیں۔ پہلے شگفتہ راہی ہوا کرتی تھیں اور نکاح کے بعد اب شگفتہ ''تبریز'' ہیں۔

شگفتہ ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ جب وہ بی۔اے کر رہیں تھی ان کی شادی علی گڑھ میں ان کیقریبی رشتے داروں میں طے کر دی گئی۔ حالانکہ راہی نہیں چاہتے تھے کہ شگفتہ کی شادی جے پور سے باہر ہو۔لیکن ان کو تبریز صاحب بہت پسند تھے۔اس لئے انہوں نے ہاں کر دی۔تبریز صاحب ملازمت کے باعث سعودی عرب میں مقیم تھے۔لیکن راہی اپنی بیٹی کو اتنی دور نہیں بھیجنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے صاف منع کر دیا اور اس لئے تبریز دو سال کے بعد ہندوستان آ گئے۔ تبریز اپنے والدین کی طرح ہی راہی صاحب کی عزت کیا کرتے تھے اور راہی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔خدا نے شگفتہ کو دو بیٹے عطا کیا ہیں۔حمّاد اور احمد۔لیکن وقت کی بے رحمی نے ان معصوموں کے سر سے والد کا سایہ بھی چھین لیا۔شادی کے ۹/سال بعد ہی جب ان کا بڑا بیٹا ۸/سال اور چھوٹا بیٹا ۴/سال کا تھا تبریز صاحب کا انتقال ہو گیا۔آج شگفتہ صاحبہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اپنے سسرال علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں۔وہاں وہ اپنا ایک کپڑوں کا چھوٹا سا بوٹیق چلاتی ہیں۔ اور ماشاءاللہ ان کے دونوں صاحبزادے تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔

شاعری کا شوق شگفتہ صاحبہ کو وراثت میں ملا ہے اس لئے وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر تھوڑا وقت شاعری کے لئے بھی نکالتی ہیں۔شروع میں ان کی اصلاح ان کے والد کیا کرتے تھے۔ وہ شگفتہ شہابی تبریز کے نام سے شعر کہتی ہیں۔ان کی شاعری کی چند مثالیں جس میں راہی شہابی کا رنگ جھلکتا ہے۔

کشمکش حیات میں الجھے کچھ اس طرح
عقبہ کی لی نہ سدھ نہ خبر کائنات کی

نعتیہ شعر ملاحظہ ہو ؎

جس دم تصور میں مجھے طیبہ نظر آنے لگا
دیدودل پر میرے باغِ ارم چھانے لگا

۹. اعزازات:

راہی شہابی کی ادبی خدمات کے لئے ان کو مندرجہ ذیل اعزازات سے نوازہ گیا:

(۱) ۱۹۶۴ء میں ان کی نظم ''میرا وطن میری زبان'' کے لئے جے پور میں منعقدہ آل انڈیا اردو کانفرنس میں انجمن ترقی اردو لکھنؤ کی جانب سے رتن ناتھ سرشار گولڈ میڈل دیا گیا۔

(۲) ۱۹۶۶ء میں ناگرک کلب جے پور کی جانب سے سابق وزیر اعظم جناب مرار جی دیسائی نے شلڈ اور سپاس نامہ دیا۔

(۳) ۱۹۷۵ء میں نیشنل اکادمی آف لینگویجز نے مدراس میں انکا جشن منایا۔ ویسٹرن ایریا کمانڈر میجر جنرل پرتھوی سنگھ نے سپاس نامہ اور شلڈ عنایت کی''

(۴) ۱۹۷۷ء میں جے پور کے ڈھائی سو سالہ جشن کے موقعے پر راہی شہابی نے ایک نظم ''جشنِ جے پور'' کے نام سے پڑھی۔ جشن کمیٹی کی جانب سے یہ نظم کتابی صورت میں شائع کی گئی اور چیف منسٹر راجستھان نے دوشالہ پیش کر کے ان کا اعزاز کیا۔

(۵) ۱۹۹۰ء میں روٹری کلب جے پور ۱۹۹۱ء میں ''بزمِ ادب جلیسر نے، ۱۹۹۲ء میں ''لوک وکاس سماجک پوم سانسکرتک منچ'' جے پور نے ۱۹۹۳ء میں راجستھان اردو اکادمی نے ان کا اعزاز کرتے ہوئے اپنے تین ایوارڈ میں سے سب سے بڑا ایوارڈ راہی شہابی کو پیش کیا۔

چند یادگار مشاعرے

ہم یہاں ان مشاعروں کا ذکر کرنے جا رہے ہیں جو محفلوں میں راہی کی مقبولیت کی ضمانت دیتے ہیں۔

یومِ اقبال:

راہی شہابی نے پہلا بیرونی مشاعرہ ۱۹۵۴ء میں منعقد ہندو پاک مشاعرہ ''یومِ اقبال'' کے سلسلے میں دہلی میں پڑھا۔ اس مشاعرے میں پاکستان سے حفیظ جالندھری، مولانا ماہر القادری

اور محترمہ سحابؔ قزلباش تشریف لائی تھیں۔ ہندوستانی شعراء میں ، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، فراقؔ گورکھپوری وغیرہ نے شرکت فرمائی۔ اس مشاعرے میں راہیؔ صاحب کا یہ شعر بہت مقبول ہوا جس کا ذکر ہم پچھلے صفحات پر بھی کر چکے ہیں۔

حوادث کو نہیں معلوم شاید
سفینہ میرا طوفاں میں پلا ہے

اس مشاعرے کی روداد روزنامہ ''نئی دنیا'' دہلی اور روزنامہ ''ہندوستان'' دہلی ۱۹۵۴ء میں مع تصاویر کے شائع ہوئی۔

لال قلعہ کا کل ہند مشاعرہ ۱۹۶۴ء:

۱۹۶۴ء میں راہیؔ شہابی کو لال قلعہ کے کل ہند مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ اس مشاعرے میں راہیؔ نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''ایک لمحہ'' پڑھی۔ یہ نظم ریڈیو سے براڈ کاسٹ کی گئی۔ اس نظم کے نشر ہوتے ہی چاروں طرف راہیؔ کے نام اور کلام کی دھوم مچ گئی۔ ایک نظم نگار کی حیثیت سے وہ جگہ جگہ مدعو کئے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۹ء میں وہ پاکستان بھی بلائے گئے۔

انجمن ترقی اردو راجستھان کی کل ہند اردو کانفرنس:

۱۹۶۴ء ہی میں انجمن ترقی اردو راجستھان کے زیرِ اہتمام مسلم مسافر خانہ جے پور میں کل ہند اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں مشہور ادیب، تاریخ نگار اور ہفت روزہ ''نیا سویرا'' کے ایڈیٹر آنجہانی پنڈت سندر لال مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوئے تھے۔ کانفرنس کی صدارت آنجہانی رام کشور ویاس سابق ہوم منسٹر راجستھان نے کی۔

یہ کانفرنس تین دن تک چلی۔ مولانا احترام الدین شاغل کانفرنس کے کنوینر تھے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کانفرنس کا افتتاح کیا تھا۔ اس اردو کانفرنس میں اردو کے موضوع پر راہیؔ شہابی نے اپنی مشہور نظم ''میرا وطن میری زباں'' پہلی بار پڑھی تھی۔ انجمن ترقی اردو لکھنؤ کی جانب سے راہیؔ شہابی کو اس نظم کی تخلیق پر رتن ناتھ سرشار گولڈ میڈل پیش کیا گیا۔

جے پور کا ڈھائی سو سالہ جشن:

۱۹۶۹ء میں جے پور کا ڈھائی سو سالہ جشن منایا گیا۔ اس موقع پر جشن کمیٹی کی جانب

سے جے پور کے رام نواس باغ میں کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ہندوستان کے ۲۵ رنامور شعرائے کرام نے شرکت فرمائی تھی۔ ان تمام شعراء سے درخواست کی گئی تھی کہ مشاعرے کے پہلے دور میں جشنِ جے پور کے موضوع پر کلام پڑھیں۔

راہی شہابی نے جشن جے پور کے موضوع پر ''شہر گلاب'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ اس نظم میں انہوں نے جے پور کی ڈھائی سو سالہ تاریخ اس قدر دلکش انداز میں پیش کی کہ جشن کمیٹی اس نظم کو کتابی شکل میں شائع کرنے مجبور ہوگئی۔ اور اس نظم کی تخلیق پر کمیٹی کی جانب سے ان کا اعزاز بھی کیا گیا۔ سابق وزیر اعلیٰ راجستھان اور سابق نائب صدر جمہوریہ ہند جناب بھیرو سنگھ شیخاوت نے راہی صاحب کو دوشالہ پیش کیا۔

امدادی مشاعرہ:

۱۹۷۰ء میں راجستھان میں زبردست قحط پڑا تھا۔ راہی شہابی نے قحط زدہ افراد کی مالی امداد کے لئے رام نواس باغ میں کل ہند مشاعرہ منعقد کیا جس میں دیگر مشہور شعراء کے علاوہ خصوصی طور پر ممبئی سے مجروح سلطان پوری صاحب نے شرکت فرمائی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے مشاعرے کی نظامت کی۔ مشاعرے کے مہمانِ خصوصی جناب شوچرن ماتھر سابق وزیر اعلیٰ راجستھان تھے۔

جودھپور کا مشاعرہ:

جودھپور والے شاہ صاحب کے عرس کا مشاعرہ اس اہتمام سے پڑھا گیا کہ شروع ہی میں مہمان شاعروں کو پڑھایا گیا۔ جے پور کے تمام شاعر پڑھنے سے رہ گئے۔ یہ رنگ دیکھ کر کچھ لوگوں نے راہی صاحب کو مجبور کیا اور وہ جیسے ہی مائک پر آئے ہزاروں آدمیوں کے اکھڑتے ہوئے قدم اس طرح جم گئے جیسے کسی نے زنجیر ڈال کر جکڑ دئے ہوں۔

یومِ غالبؔ:

۱۹۶۴ء میں جے پور میں مرزا غالبؔ کی یاد راہی شہابی نے انجمن شعروادب جے پور کے زیرِ اہتمام ممتاز باغ میں ''یومِ غالبؔ'' کے نام سے منائی۔ جس کے مہمان خصوصی نواب امین الدین خاں صاحب سابق وزیرِ راجستھان تھے۔ اس موقع پر راجستھان میں ایک مجلّہ ''یادگارِ غالب'' کے نام سے اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا۔

یومِ چکبستؔ:

پنڈت برج نارائن چکبستؔ کا یوم راہیؔ صاحب نے انجمن شعروادب جے پور کے زیرِ اہتمام مسلم مسافر خانہ میں منایا۔کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت وزیرِ اعلیٰ راجستھان آنجہانی ہری دیو جوشی نے فرمائی۔چکبستؔ کی قومی شاعری پر مقالے پیش کئے گئے۔راہیؔ شہابی نے ایک سووینیر''یادگارِ چکبستؔ'' کے نام سے اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع کیا۔

یومِ شہیدانِ وطن:

راہیؔ شہابی نے انجمن شعروادب کے ہی زیرِ اہتمام مہارانی کالج جے پور میں ایک جلسہ اور کل ہند مشاعرہ منعقد کیا۔ جلسے کی صدارت مرحوم برکت اللہ خان نے فرمائی۔مشاعرے پر ٹکٹ لگایا گیا تھا۔مشاعرے سے ہونے والی آمدنی ہندو پاک جنگ میں شہید ہونے والوں کی بیواؤں کے امدادی فنڈ میں جمع کروائی گئی۔

شامِ شکیلؔ:

مشہور فلمی نغمہ نگار اور بلند پایہ شاعر حضرت شکیل بدایونی مرحوم کی یاد میں راہیؔ شہابی نے انجمن شعروادب جے پور کی زیرِ اہتمام شامِ شکیلؔ کے نام سے مسلم مسافر خانہ جے پور میں منائی گئی اس موقع پر بھی راہیؔ شہابی نے ایک سووینیر''یادگارِ شکیلؔ'' کے نام سے شائع کیا۔

یومِ جگرؔ:

۲۲ ستمبر ۱۹۶۰ء کو راہیؔ شہابی نے بمقام چاند پول بازار جے پور شہنشاہِ تغزل حضرت جگرؔ مرادآبادی کا یوم منایا۔اس موقع پر کل ہند مشاعرہ منعقدہ کیا گیا۔آنجہانی موہن لال سکھاڑیا، سابق وزیر اعلیٰ راجستھان جلسہ کے مہمانِ خصوصی تھے۔حضرت اجرؔ جے پوری نے جلسے کی نظامت فرمائی۔جگرؔ صاحب پر مقالات پڑھے گئے اور''یادگارِ جگرؔ'' کے نام سے سووینیز شائع کیا گیا۔

رضاؔ شیدائی کے ان اشعار سے ہم اس باب کا اختتام کرتے ہیں۔اشعار ملاحظہ ہو۔

جو راہ دکھاتے تھے وہ راہیؔ شہابی تھے
محفل پہ جو چھاتے تھے وہ راہیؔ شہابی تھے

نظروں میں سمائی ہے اب تک بھی شبیہ ان کی
ہر دل کو جو بھاتے تھے وہ راہی شہابی تھے

رضا شیدائی

☆☆☆

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی آپ بیتی، یادوں کی دنیا کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد ارشد حسین، اسسٹنٹ پروفیسر
فخر الدین علی احمد ٹیچرس ٹریننگ کالج، دربھنگہ

ملخص

اپنی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال اور اپنی زندگی کے تجربات، واقعات و حادثات کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا آپ بیتی کہلاتا ہے۔ آپ بیتی میں متعلقہ شخصیت اپنی زندگی کے حالات، مشاہدات اور تجربات بلکہ فکری نظریات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی زندگی کے اخلاق و عادات کا کوئی پہلو مخاطب کے سامنے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی شخصیت کے حوالے سے بلا تکلف اظہار حقائق کا نام آپ بیتی ہے۔

یادوں کی دنیا مشہور اقبال شناس ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی آپ بیتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ معتبر تاریخ داں اور ماہر آثار قدیمہ کے طور پر بھی

معروف ہیں۔ یادوں کی دنیا پہلی مرتبہ شبلی اکادمی (دارالمصنفین) اعظم گڑھ سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ آپ بیتی کل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ۲۷۴ صفحات پر مشتمل یہ آپ بیتی نہ صرف ان کی شخصیت اور کردار سے روشناس کراتی ہے بلکہ ان کی دگر تصنیفات کے مطالعہ میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

یادوں کی دنیا کو مکمل آپ بیتیوں کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس آپ بیتی سے مصنف کی پوری زندگی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ آپ بیتی واقعات کی سچائی اور حقائق بیانی کا مظہر ہے۔ چنانچہ دیباچے میں بھی مصنف نے خود لکھا ہے کہ:

> ''جہاں تک ہوسکا ہے واقعات کو کم و کاست بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نہ کسی کو اچھالنا مقصود ہے اور نہ کسی کو خواہ مخواہ گرانا۔ اپنی ذات کی کوتاہیوں کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اس لئے بغیر احتساب نفس کے حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔
>
> (یادوں کی دنیا، ص:۹)

آپ بیتی کے ابتدائی دو ابواب خاندان کا تاریخی پس منظر اور گھریلو احوال پر مشتمل ہیں۔ ان دونوں ابواب میں بڑی تفصیل سے ہندوستان میں پٹھانوں کی آمد اور اس عہد کے سیاسی و سماجی ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آپ بیتی کا تیسرا باب یوسف حسین خاں کے ساتوں بھائیوں کے احوال زندگی پر مشتمل ہے۔ سات بھائی کا عنوان ڈال کر اپنے بھائیوں کی جائے پیدائش تاریخ ولادت بھی تحریر کئے ہیں۔ ان کا اپنا نمبر پانچواں ہے۔ پانچویں نمبر پر انہوں نے اپنی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کا تذکرہ چھیڑا ہے۔ اسی کے ذیل میں بچپن کی یادیں، اسکول میں داخلہ اور پھر ترک اسکول وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ قائم گنج کی قصباتی زندگی کا نقشہ اپنے گھر میں قیام، گھر کا جائے وقوع، نوکروں یہاں تک کہ پالتو کتوں کا ذکر تک موجود ہے۔ والدہ کے انتقال کا گھریلو زندگی پر اثر، اور اکابرین کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

اس آپ بیتی کا چوتھا باب فخر خاندان کے عنوان سے ہے۔ اس عنوان سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین کا خاکہ تحریر کیا ہے۔ اس خاکہ میں ستر صفحات ہیں جس میں

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند تک پہنچنے میں ان کی کن صلاحیتوں اور لیاقتوں نے اہم رول ادا کیا ہے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی انشاپردازی اور فن خطابت پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب میں مصنف نے اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

پانچواں باب زمانہ طالب علمی کی حسین یادوں پر مشتمل ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ان کی مادر علمی رہی ہے۔ ۱۹۲۱ میں یہاں داخلہ لیا۔ سحر خیزی اور نماز کی پابندی وغیرہ کا تذکرہ اس باب کو مزید خوبصورتی عطا کرتے ہیں۔ جامعہ کے اس وقت کے اساتذہ کا مفصل تذکرہ اس باب میں ملتا ہے۔ اس دوران علامہ اقبال سے ان کی ملاقات ہوئی اس واقعہ کا تذکرہ بھی دلچسپی کا ذریعہ بنتا ہے۔

چھٹے باب میں اس زمانے کے احوال مذکور ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں فرانس میں تعلیمی زندگی گذار رہے تھے۔ انہوں نے پیرلیس یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لئے ایک مقالہ لکھا۔ مقالہ کا عنوان تھا۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے صوفی اور سنت۔ اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ اس باب میں فرانس کے سیاسی، معاشرتی اور ادبی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ فرانس کے طرز تعمیر کی بھی تعریف کی گئی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین ایک خوبرو اور حسین وجمیل انسان تھے اسی لئے حسن و جمال کی تعریف بھی خوب کیا کرتے تھے۔ اس آپ بیتی میں پیرس کی عورتوں کی تعریف اور اس کے حسن و جمال کا تذکرہ انہوں نے اس طرح کیا ہے:

> ''میں نے ایسا باغ و بہار حسن اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جنوبی فرانس کی عورتیں نہایت حسین ہوتی ہیں۔ ان کے حسن میں مجھے کچھ مشرقیت محسوس ہوئی۔ رنگ گورا، آنکھیں اور بال سیاہ، قد بوٹا سا، لڑکیاں رخساروں پر غازہ اور ہونٹوں پر روژ لگاتی ہیں۔ جس سے ان کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ جب وہ بولتی تھیں تو مجھ اجنبی کو جوان کی گفتگو سمجھنے سے قاصر تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔''

(یادوں کی دنیا، ص:۱۶۴)

دوران قیام فرانس انہوں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھی اوراس طرح انہوں نے اس زبان کی ادبی تحریکوں کا مطالعہ بھی کیا۔انہوں نے انگلینڈ، اٹلی اور سوئزر لینڈ کی سیر بھی کی اس آپ بیتی میں ان جگہوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔اس اعتبار سے آپ بیتی کا یہ باب سفر نامہ کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف، جرمنی، فرانس، اسکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ کی ترقی وتابانی، تہذیبی ومعاشرتی زندگی اور علمی وادبی ماحول سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔

اس آپ بیتی کا ساتواں باب اس زمانے کی یادوں سے متعلق ہے جب ڈاکٹر صاحب جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تاریخ سے منسلک رہے۔۱۹۳۰ میں وہ جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے بحال ہوئے۔ یہاں انہیں عظیم شخصیات سے ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ چنانچہ جن شخصیات سے ان کی اس دوران ملاقاتیں ہوئیں پوری فنکاری کے ساتھ انہوں نے ان کے خاکے کھینچے۔ چنانچہ یادوں کی دنیا میں علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولوی عبدالحق، حکیم اجمل خاں، سروجنی نائیڈو، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسرت موہانی، غلام السیدین، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، اور جوش ملیح آبادی جیسی اہم شخصیات کے بہترین خاکے اس آپ بیتی میں موجود ہیں اور ان خاکوں میں انہوں نے تعصب سے ماورا ہوکر بے لاگ اور بے باک انداز اپنایا ہے۔جس سے ان کی بے تعصبی کا پتہ چلتا ہے۔

وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ چنانچہ اس آپ بیتی کا آٹھواں باب اسی یونیورسٹی پر مشتمل ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لگ بھگ وہ سات سال رہے۔اس زمانے میں ہونے والے واقعات وحوادثات کا تذکرہ پوری وضاحت کے ساتھ اس آپ بیتی میں مذکور ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے یادوں کی دنیا میں اپنے ذاتی زندگی اور ازدواجی حالات کو بھی بیان کیا ہے۔لیکن انہوں نے اپنی زندگی کو تفصیلی طور پر پیش نہیں کیا ہے۔اہل وعیال کے تذکرے سے انہوں نے اعراض کیا ہے جس سے ان کے قارئین کو تشنگی کا احساس ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود آپ بیتی اس زمانے کی تہذیبی، ثقافتی، علمی، سیاسی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں ایک صاف ستھرے انسان، سچے ادیب کی حیثیت سے رونما ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر حسن وقار گل اس آپ بیتی کو اس عہد کی علمی، سیاسی وثقافتی تاریخ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یوسف حسین خاں کی یہ کتاب ان کی آپ بیتی ہی نہیں، اس میں ان کے دور کی

تمدنی تاریخ ہے۔ فرانس اور آسٹریلیا کے سفرنامے ہیں، مشاہیر کے خاکے ہیں، احساسات کی دنیا ہے، جذبات کی فراوانی ہے، فکر کے دھارے ہیں۔ سنجیدہ باوقار لب ولہجہ میں سلاست کے ساتھ وہ سب پیش کر دیا ہے۔ جوان کے ذہن اور دل میں تھا۔ یہ پڑھنے والوں کے لئے معلومات کا خزانہ ہے اور ذہن کے لئے دعوت فکر ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا عام نظروں میں جو کچھ ہے عالم کی نظر میں اس سے کہیں زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی ہے۔''

(اردو میں سوانح نگاری آزادی کے بعد، ص:۴۱۳)

اسلوب کے اعتبار سے یادوں کی دنیا ایک اچھی آپ بیتی شمار ہوتی ہے۔ زبان عام فہم ہے لیکن ادبی ہے۔ قصباتی زبان کا استعمال بھی ہے۔ عربی ہندی کے الفاظ بھی لئے گئے ہیں۔ ان کے طرز نگارش میں ایک اچھوتا پن محسوس ہوتا ہے۔ اسلوب میں متانت وسنجیدگی کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مبالغہ آرائی اور شاعرانہ تکنیک سے مبرا اور پاک ہے۔ واقعات نگاری کے تسلسل میں ایک خاص ربط ہے۔ جس سے پڑھنے میں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ندیم احمد لکھتے ہیں:

''اس میں تاریخ، ادب، نفسیات اور عمرانیات کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ یہ خود نوشت اپنی معلومات اور ندرت اسلوب کی وجہ سے بھی اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔''

(بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری، ص:۱۲۴)

ڈاکٹر شبیہ کاظمی تحریر فرماتے ہیں:

''یادوں کی دنیا'' ہر پہلو سے ایک مکمل اور جامع آپ بیتی ہے جو آپ بیتی نگاری میں ایک زبردست اضافہ ہے۔ مصنف نے اپنی زندگی کے حالات شروع سے تادم تحریر انتہائی محنت، دیانت، خلوص اور صداقت سے بیان کئے ہیں۔ اسطرح انہوں نے اپنی اس تصنیف کے شروع میں آپ بیتی نگاری کے جو تین اصول پیش کئے تھے ان کی پوری پوری پابندی کی ہے۔''

(یوسف حسین خاں احوال وآثار، ص:۳۱۸)

سید محمد حسنین لکھتے ہیں:

''یہ سوانح حیات، حدیث دل اور حدیث سردلبراں سے معمور ہے، اس سوانح حیات میں مشاہدات کی رنگینی ہے اور محسوسات کی حرارت بھی، فکر ونظر کی تازگی او رروح عصر کی تابندگی بھی، متبدل واقعات سے لپٹی صداقتیں، داستانیں حیات بن گئی ہیں اور مصنف کی ملک وملت سے نا آسودہ تمنائیں اس کے روز وشب کا افسانہ ہوگئی ہیں۔''یادوں کی دنیا'' کو صنفی لحاظ سے میں ایک بلند پایہ تصنیف قرار دیتا ہوں۔''(نفسی مطلب،ص:۴۱۔۴۰)

ان ساری خوبیوں کے باوجود بعض مقامات پر ضرورت سے زیادہ تفصیل فنی اعتبار سے اس آپ بیتی کو غیر متوازن قرار دیتی ہے فرانس میں سوربون کی تاریخ لکھتے ہوئے اسی طرح اپنے برادر ڈاکٹر ذاکر حسین کا ذکر میں بے جا تفصیل سے آپ بیتی میں نقص پیدا ہوگیا ہے۔اس باب میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے خود سے زیادہ دوسروں کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ خود ان کے بھتیجے پروفیسر مسعود حسین خاں تحریر کرتے ہیں:

''یوسف حسین خاں خودنوشت لکھنے کے آداب سے کما حقہ عہد برآ نہیں ہوسکتے ہیں۔ایک تو ان میں وہ جرأت رندانہ نہیں، جو وہ اپنی زندگی کو مکمل طور پر بے نقاب کرسکیں، دوسرے وہ اکثر بھول جاتے ہیں کہ خودنوشت لکھ رہے ہیں یا شخصیت اور واقعات پر مقالے انہوں نے اپنی سیرت یا زندگی کے بہت کم نقوش اجاگر کئے ہیں۔''(یوسف حسین خاں،ص:۶۶)

اسلوب اور طرز نگارش کے اعتبار سے یادوں کی دنیا ایک اچھی آپ بیتی شمار کی جاسکتی ہے۔ زبان وبیان کے لحاظ سے یہ عمدہ آپ بیتی ہے۔جس کے مطالعہ سے مصنف کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔

☆☆☆

شاہ مقبول احمد کے افسانے: ایک تجزیاتی مطالعہ''

فاطمہ خاتون
(ریسرچ اسکالر (اردو)
شعبۂ عربی، فارسی، اردو اور مطالعات اسلامی
بھاشا بھون، ویشو بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن- 731235

ملخص

شاہ مقبول احمد مغربی بنگال کی افسانہ نگاری کا اہم نام ہے۔ مغربی بنگال میں ترقی پسند افسانوں کے بنیادگزاروں میں ان کا مقام اہم ہیں۔ تاہم وہ ہمیشہ صوبائی تعصب کا شکار رہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر محققین و ناقدین کا قلم خاموش رہا۔ انھوں نے بیشک افسانے کم لکھے مگر جو لکھا معیاری لکھا۔ ویسے بھی کسی کی ایک تخلیق بھی اس کے تخلیق کار کو ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال راجندر سنگھ بیدی ہے، جس کی ایک ناولٹ

''ایک چادر میلی سی'' نے انھیں ناول نگار کے صف میں لا کھڑا کیا۔شاہ مقبول احمد کا واحد افسانوی مجموعہ ''پانچ افسانے اور انشائیہ'' شائع ہو کر قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب رہا ہے۔اب یہ ہم جیسے اسکالر کا ادبی فریضہ ہے کہ ان کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کر کے اس کے مصائب ومحاسن سے ادب کے قاری کو متعارف کرائے تا کہ ایک افسانہ نگار کو اس کا جائز حق مل سکے۔

☆☆☆☆☆

مغربی بنگال کی سرزمین اردو نثر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔اردو ادب کا کوئی بھی قاری فورٹ ولیم کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔اردو افسانہ کی ترقی میں بھی یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنا خون جگر صرف کیا۔بنگال میں افسانہ نگاری کا سنہرا دور ۱۹۳۵ء کے ترقی پسند تحریک کے دور میں شروع ہوا۔اس سے قبل یہاں طبع زاد افسانے کم اور ترجمے زیادہ لکھے گئے۔ترقی پسند تحریک کے عہد میں بنگال میں افسانہ نگاروں کی لمبی کھیپ سامنے آئی جن میں کچھ افسانہ نگاروں کا نام آسمان کی بلندی پر چمکا اور کچھ گمنامی کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔یہ ستم ظریفی علاقائی سطح پر ادیبوں کو جھیلنی پڑتی ہیں، جس میں بنگال کا نام سرفہرست ہے۔مغربی بنگال سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی یہ بدنصیبی ہے کہ ہمارے معزز نقادین ومحققین ان پر تفصیلی بحث نہیں کرتے اور کبھی ان پر لکھنے کی باری آتی ہے تو کچھ چنندہ ادیبوں اور افسانہ نگاروں پر ہی نظر کرم کی جاتی ہے۔لیکن اب ادب کو پرکھنے کا نظریہ بدل رہا ہے۔مقامی سطح پر کئی نقاد اور محقق سامنے آرہے ہیں جو ان لوگوں پر کام کر رہے ہیں جن کا نام اس گمنامی میں کہیں ماند پڑ گیا تھا۔ایسے ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام شاہ مقبول احمد کا ہے، جنھوں نے اردو ادب کی خدمت میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کر دیا مگر ان کی جو پذیرائی ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ شاہ مقبول احمد اچھے مدرس تھے ساتھ ہی انھوں نے اردو ادب کے کئی اصناف میں طبع آزمائی بھی کی جس میں تحقیق، تنقید، انشائیہ، افسانہ، طنز ومزاح اور شاعری وغیرہ شامل ہیں۔

شاہ مقبول احمد کے افسانے ترقی پسند عہد سے تعلق رکھتے ہیں جو حقیقی زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ بنگال میں ترقی پسند افسانہ کی بنیاد مقبول احمد نے ڈالی تو شاید بے جا نہ ہوگا۔عشرت بیتاب نے بھی انھیں بنگال کا پہلا ترقی پسند افسانہ نگار کہا ہے۔جس کا انکشاف عشرت بیتاب کے نام لکھے خط سے ہوتا ہے، اس میں شاہ مقبول احمد صاحب لکھتے ہیں کہ:

''کلکتہ واپس آیا تو آپ کا گرانقدر مقالہ پڑھا، بہت پسند آیا۔ یہ آپ نے بالکل صحیح تحریر کیا ہے کہ بنگال میں ترقی پسند افسانوں کی پہل شاید مجھ سے ہی ہوئی ہے۔ معاصر افسانہ نگار اس وقت رومان کی دنیا میں محو تماشا تھے۔ بہرحال صرف پانچ افسانے کسی افسانہ نگار کا وقیع سرمایہ تو نہیں ہو سکتے۔ کوشش کی تھی زمانے نے گوشۂ تنقید و تاریخ میں جگہ دے دی''۔ طالب خیر: شاہ مقبول احمد

شاہ مقبول احمد کا رجحان مقالہ نگاری کی طرف زیادہ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ افسانہ نگاری پر پوری طرح توجہ نہ دے سکیں مگر انھوں نے جتنا لکھا وہ معیاری ہیں اور انھیں بطور افسانہ نگار ایک الگ مقام عطا کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا واحد مجموعہ ''پانچ افسانے اور انشائیہ'' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل پانچ افسانے اور ایک انشائیہ'' قوت فیصلہ'' شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل تمام افسانے اکتوبر ۱۹۴۰ء سے اگست ۱۹۴۱ء کے درمیان لکھے گئے، یوں دیکھا جائے تو انھوں نے ایک سال کی مدت میں پانچ افسانے لکھیں۔ یہ دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا جب کئی افسانہ نگار پروپیگنڈہ پر اتر آئے تھے مگر شاہ مقبول احمد نے اپنے افسانے کو اشتہاری اور پروپیگنڈہ بننے نہیں دیا بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں پیش آنے والے واقعات و حالات کو حقیقی روپ سے افسانے کے قالب میں ڈھال دیا۔ ان کے افسانے مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے تھے، جسے کتابی صورت میں لانے کی مقبول صاحب نے کوششیں نہیں کی۔ لیکن ان کے شاگرد عزیز ایم، اے نصر اور نواب خان روہوی نے ان افسانوں کو دیکجا کیا اور اسے کتابی شکل میں لانے کے کام کو آگے بڑھایا تب جا کر یہ شائع ہوئی۔

شاہ مقبول احمد کی نگارشات کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے شروع ہوا اور اپنی عمر کے آخری پڑاؤ تک وہ مسلسل لکھتے رہے۔ یوں تو ان کے افسانوں کی تعداد زیادہ نہیں لیکن اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، شاہ مقبول احمد کی افسانہ نگاری اور ان کے نظریے کے متعلق عبدالرؤف لکھتے ہیں کہ:

''موصوف کی نگارشات کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے انشائیے اور افسانے لکھے، اگرچہ ان کی تعداد آٹھ دس سے زائد نہیں۔ لیکن افادیت کے اعتبار سے وہ قابل قدر ضرور ہیں کیوں کہ ان کی روشنی میں نئی

جہتیں متعین کی جاسکتی ہیں۔ بنیادی طور پر وہ افسانہ نویس نہیں تھے، لیکن اس صنف کے ارتقاء کے متعلق ایک آفاقی نظریہ رکھتے تھے''۲۔

افسانے کے متعلق شاہ صاحب کا نظریہ کافی اہم ہے وہ افسانے کے خام مواد کے لیے ادھر ادھر نہیں بھٹکتے بلکہ ان کے نزدیک زندگی میں پیش آنے والا ہر واقعہ افسانے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ شاہ مقبول احمد صاحب فرماتے ہیں کہ:

''پوری کائنات ایک عظیم افسانہ ہے۔ زندگی واقعات وسانحات سے بھری پڑی ہے۔ بکھرے ہوئے اجزائے کائنات کسی بھی افسانہ کا خام مواد بن سکتے ہیں۔ اور کہیں سے بھی افسانہ شروع ہوسکتا ہے۔ پھر بھی تلاشِ موضوع افسانہ نگاروں کی ایک ایسی عجیب ادا معلوم ہوئی کہ اس پر میرا افسانہ ''موضوع'' شاید ایک طنز بلیغ بن گیا۳۔

مقبول صاحب کا یہ بیان نہایت اہم ہے۔ انھوں نے اپنے افسانہ ''موضوع'' کا ذکر کر کے تلاشِ موضوع کے لیے بھٹکنے والے افسانہ نگاروں کو آئینہ دیکھایا ہے۔ کیوں کہ ان کا یہ افسانہ ان کی حقیقی زندگی میں پیش آنے والے ایک معمولی واقع پر منحصر ہے۔ جس میں انھوں نے سردی کے موسم میں تیسرے درجے کے بھیڑ بھاڑ والے ڈبے میں سفر کرنے کو موضوع بنا کر ایک موثر افسانہ تخلیق کر دیا۔ اس طرح کا افسانہ تخلیق کرنے کے لیے کئی افسانہ نگار موضوع کی تلاش میں مختلف صحراؤں کی خاک چھانتے ہیں۔

شاہ مقبول احمد کے افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ''تبدیلی'' ہے جو اکتوبر ۱۹۴۰ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ یہ دور ایسا تھا جب زیادہ تر افسانہ نگار ترقی پسند تحریک سے اثر پذیر ہو رہے تھے۔ مقبول صاحب بھی منشی پریم چند سے حد درجہ متاثر تھے، جس سے ان کے ذہن میں تغیرات ہو رہے تھے۔ ان کا افسانہ ''تبدیلی'' انھیں حالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس افسانہ کے سلسلے میں مقبول صاحب ''ایک بات'' عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ:

''سب سے پہلے جن ذہنی تغیرات کا مجھ پر بدرجہ غایت اثر ہوا تھا اس کا اعلان میں نے اپنے پہلے افسانہ ''تبدیلی'' کے توسط سے کیا''۴۔

اس افسانہ میں گاؤں کا تعلیم یافتہ شخص شہر جاتا ہے اور پھر چھٹی میں جب گاؤں آتا ہے تو

گاؤں اور شہر کی زندگی کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ گاؤں کے لوگوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے رفتہ رفتہ اس کے اندر تبدیلی آتی جاتی ہے۔ وہ ہر وقت گاؤں کے لوگوں کے حالات کو دیکھ کر فکر مند رہتا ہے اور پہلے جیسا ہنسنا بولنا، کھیلنا کودنا، دوستوں کی محفلوں میں قہقہے لگانا سب آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ افسانہ مقبول صاحب کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ تعلیم اور نوکری کے سلسلے میں انھیں کلکتہ میں مقیم رہنا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی تقرری اسلامیہ کالج میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے ہوئی اس کے بعد کلکتہ یونیوسٹی میں جز وقتی لکچرر بنے۔ آخر میں مولانا آزاد کالج سے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے یوں ان کا زیادہ وقت شہر کی بھیڑ بھاڑ میں گزرا اور جب بھی چھٹی ملتی وہ اپنے آبائی گاؤں ضلع مونگیر بہار چلے جاتے۔ گاؤں کی پرسکون اور دلفریب فضا ان پر خوشگوار اثر ڈالتی، مگر گاؤں کے لوگوں کے حالات انھیں اندر اندر گھلاتے رہتے، اور یہی حال اس افسانہ کے ہیرو کا ہے۔ اس افسانہ میں گاؤں کی منظر کشی کمال کی ہے۔ اس افسانہ میں جزئیات کا ذکر دیکھئے:

> ''ہوا کے تیز و تند جھونکوں کے سامنے اونچی اونچی دیواریں کھڑی کی گئی تھیں۔ روشن اور چمکدار دھوپ کے مقابل کھپڑیل اور تہ بہ تہ پھونس کے چھپر تیار کئے گئے تھے۔ جدھر آنکھیں اٹھاؤ منزلوں میں میدان خالی ہے۔ فضا کی اس بے پناہی کے لیے پہاڑوں اور ندیوں کے دامن کا سہارا لیا گیا تھا۔[۵]

اس افسانہ میں میاں بیوی کی پرخلوص محبت ہے تو وہی دوستوں کی فکر مندی بھی، انسانی رشتوں کے مختلف پہلوؤں کی جھلک اس افسانے میں دیکھائی دیتی ہے۔ اس کہانی کے ہیرو کی حالت زار کو اس کی اہلیہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ تو دوست اور بزرگوار اس کی اس روش سے ناخوش اس نوجوان کے اس حالت کی اہم وجہ اس کی عصری حالات سے واقفیت اور اس کا مسلسل غور فکر کرنے کا رویہ تھا، یہ ناخوشگوار حالات ہمارے سماج کا اہم جز بن چکے ہیں جس کا ذکر کرتے ہوئے راوی کہتا ہے کہ:

> ''میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کو کبھی سرسری طور سے نہیں دیکھتا، گھر والوں کی کھوکھلی سبکدوشی، تعلیم و تربیت سے محروم بچوں کی قدرتی آوارہ گردی، مالی مشکلات کی بنا پر عزیزوں میں ازدواجی تعلقات میں کشیدگی، بیماروں کے مناسب مگر گراں علاج کے سامنے جن جنات، آسیب سایہ کی تاویلیں اور اس

کے لیے دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک میں پناہ کی جستجو، ان پڑھ بیویوں کی چیخ پکار اور بے صبری، نادار شوہروں کی کوفت اور دل کی گرفت گی، بڑے بوڑھوں کی نئے زمانے سے بیزاری، پیارے پیارے ننھے بچوں کی پیدائش پر حقیقی خوشی کا فقدان، یہ اور اس کے قسم کے دیگر حالات تھے۔ جو میرے سامنے مستقل غور وفکر کے موضوع بن کر پیش ہوتے تھے''۶۔

یہ سماج کی تلخ حقیقتیں ہیں جس سے کوئی حساس فرد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور مقبول صاحب ایسے ہی حساس ذہن کے مالک تھے، جنھوں نے ان مسائل کا ذکر نہایت عام فہم زبان میں اپنے افسانہ ''تبدیلی'' میں پیش کیا ہے۔

شاہ مقبول احمد کے مجموعے کا دوسرے افسانہ ''دوسرا رخ'' بھی اکتوبر ۱۹۴۰ء کا لکھا ہے۔ اس افسانے کی ابتداء میں مقبول صاحب نے عرض کر دیا ہے کہ مقامات وافراد فرضی ہیں۔ چوں کہ ان کی کہانیاں ان کے ذاتی تجربے کی غماز ہے اور ان کا انداز پیش کش ایسا ہے کہ لوگ اس مقامات وافراد کو حقیقی مان لیتے ہیں اور ذکر کئے مقام سے جوڑ کر افسانے کو دیکھتے ہیں اس افسانہ میں خانقاہ سے منسلک لوگوں اور خانقاہوں میں سالانہ عرس وقوالیوں کے موقعے پر ہونے والے ہنگاموں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے سے متعلق مقبول صاحب ''ایک بات'' میں فرماتے ہیں کہ:

''مقدس اور واجب التعظیم خانقاہوں کی مسند رشد وہدایت کا معتقد قدیم ہونے کے باوجود کچھ ایسے مناظر بھی مشاہدے میں آئے جس کے ایک رخ کی روداد افسانہ ''دوسرا رخ'' کا عنوان بن گئی''۷۔

ان کے افسانہ میں ہمیں وہ تصویریں صاف طور پر مل جاتی ہیں جو ہماری روحانی اور عرفانی قدروں کی ترجمانی اور ہماری ثقافتی روایات کی علم بردار ہوتی ہیں۔ اگر چہ حقیقت یہ ہے کہ بڑھتے ہوئے سماجی اور معاشی خلفشار کے ملبوں میں یہ روایات کہیں دفن ہو چکی ہیں۔ افسانہ ''دوسرا رخ'' جہاں محفل سماع کا مکمل نقشہ پیش کرتا ہے تو وہی اس میں خانقاہوں میں مذہب کے نام پر جو لوگ اپنا مفاد حاصل کرتے ہیں ،اس پر طنز بھی کیا گیا ہے۔ خانقاہ میں جب لوگوں کو دستر خوان پر کھانے کے لیے بیٹھایا گیا تو کچھ لوگوں نے کس طرح خانقاہوں کی لوٹ کھسوٹ کو اجاگر کیا افسانے کے چند جملے ملاحظہ ہو:

''-غضب خدا کا لوٹ ہے ، اندھیر ہے، ہر سال ایک نہ ایک کمی ہی نظر آتی ہے

-سارے وقف کی آمدنی تو ہے مگر اپنے دوزخ کے بھرنے سے فرصت کہاں.....

-گزشتہ سال پھر بھی یہ بدنظمی نہ تھی کم از کم باقر خانی کے ٹکڑے تو نظر آتے تھے.....

-خدا کے یہاں یہ لوگ نہ جانے کن اعمال ناموں کے ساتھ جائیں گے.....

-جی جناب! گزشتہ سال اس میں (شربت میں) سے بھی پستہ کی سوائیاں غائب تھیں.....

-مگر خیر شربت تو تھا، دل کی آگ تو بجھ جاتی تھی۔اس سال تو خاک پھانکنے کے سوا اور کیا ہے''۸۔

اس طرح کے جملے نہ صرف طنز کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں بلکہ اس کے ذریعے مقبول صاحب معاشرے کی اصطلاح بھی کرنا چاہتے ہیں۔ان کا تعلق مذہبی خاندان سے تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خانقاہوں کا مشاہدہ نہایت قریب سے کیا تھا اور اس کے محاسن ومصائب سے وہ بہ خوبی واقف تھے جس کی تفصیل ہمیں اس افسانے میں مل جاتی ہے۔ جزئیات کی تفصیل بیان کرنے میں مقبول صاحب کو قدرت حاصل تھی۔اس ضمن میں محفل سماع کا ایک منظر دیکھئے:

''کھانے پینے کا مرحلہ طے ہو چکا تھا، لوگ ادھر ادھر لوٹ پوٹ کر رہے تھے تا کہ مناسب قیلولہ ہو جائے، پھر تو رات بھر قوالی سننا ہے۔ بارہ دری میں تال سر کی آواز آئی، لوگ دھڑ پڑ کرتے ہوئے اٹھے اور کمرے میں مجلس سماع کے مطابق حلقہ باندھ کے دیوار سے لگ کر بیٹھ.....کچھ دیر تک تو ساز میں ساز ملائے جاتے رہیں۔آخر موسیقی کے سحر نے کام کیا اور محفل جمنے لگی۔نغمہ سرائی شروع ہوئی۔ پہلے پارسی کی دو چار معرفت کی چیزیں گائی گئیں۔پھر نعت میں ''صلی علی محمد''، قسم کی وجد آفریں چیز شروع ہوئی۔کیا کہنا ایک عجیب سماں بندھ گیا۔اس پر ''اے وا'' کا ٹکرا جس کو کہنے والے کہیں گے روحِ نغمہ ہے۔تاثرات کو قائم رکھنے کے لیے فوراً ہی بعد ایک پوربی چیز چھڑ گئی۔ہائے اب کہاں ہوش وحواس، محفل غرق

تھی، بزم میں سناٹا تھا۔ سرور کائنات کی طرف اشارہ تھا، جب اہل بزم نے سنا ''گورے بدن پر چاندی چھنکے'' بس غضب ہی تو ہو گیا صبر وقرار رخصت ہوئے۔ بام ودر جھومنے لگے۔ چھتیں اڑنے لگیں، فرش کانپنے لگا، عالم رقص میں تھا، فضا پر وجد طاری ہوا۔ میرے پاس ایک صاحب تندرست وتوانا، شیروانی سر پر، دو پلی ٹوپی خلطہ دار غرارہ ملبوس متانت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی طرف جو دیکھتا ہوں تو حالت متغیر ہے۔ چہرہ تمتماتا ہوا آنکھیں ڈبڈباتی ہوئیں ایک رقت طاری ہے۔ انھوں نے انگشت شہادت اٹھائی، ضبط نہ ہوسکا، قابو سے باہر ہو گئے۔ دونوں ہاتھ بڑی تیزی سے آسمان کی طرف اٹھائے۔[9]

محفل سماع کا منظر اس سحر انگیزی سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ بذات خود محفل سماع میں موجود ہیں۔

اس مجموعہ میں ان کا واحد انشائیہ ''قوت فیصلہ'' دسمبر ۱۹۴۰ء کی تخلیق کردہ ہے۔ مقبول صاحب خود اقرار کرتے تھے کہ انھیں رشید احمد صدیقی کا طرز پسند ہے اس لیے اس انشائیہ میں شاہ صاحب نے رشید احمد صدیقی کے طرز بیان اور انداز پیش کش کو اپنانے کی کوششیں کی ہے۔

افسانہ ''جوڑے کی تلاش'' فروری ۱۹۴۱ء کی تخلیق ہے۔ اس افسانہ میں گاؤں کی کھلی جگہ میں رہنے والے شخص کو کلکتہ جیسے بڑے شہر میں من پسند کرائے کے گھر کی قلت کے علاوہ کسی تنگ کمرے میں کئی لوگوں کے ساتھ رہنے سے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ بھی ان کی زندگی میں پیش آنے والے ایک تلخ واقع پر مبنی ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے ''ایک بات'' کے تحت مقبول صاحب لکھتے ہیں کہ:

''بی اے کرنے کے بعد بیکر ہوسٹل سے ہوسٹل بدر ہو کر کلکتہ میں سکونت کے لیے کمرہ کی ضرورت ہوئی باوجود یہ کہ جناب ''To Let'' صاحب کے مکانات اس زمانے میں کلکتہ میں قدم قدم پر موجود تھے، مگر پھر بھی میری اوسط اور غیر معقول بضاعت مکان کی تلاش میں شریک داروں کی متلاشی ہوئی میں نے اپنے تلخ تجربات ''جوڑے کی تلاش'' کے زیر عنوان افسانہ میں اپنے عہد کے

قارئین تک پہنچادیے''۱۰۔

جس تلخ تجربات کا ذکر مقبول صاحب نے تحریر کیا ہے اس کی ایک مثال اس افسانے میں دیکھئے جب کمرہ نہ ملنے کی صورت میں کہانی کے راوی کو چار لوگوں کے ساتھ مشترکہ ایک چھوٹے کمرے میں رہنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس کے ساتھ کیا دقتیں پیش آئی۔

''میرے برابر جو صاحب سوئے تھے انھوں نے نیند میں کروٹ جو لی تو پورا ایک پاؤں مجھ پر گد سے پڑ گیا، الٰہی خیر کہتا ہوا میں چونک پڑا، انھیں بھی ہوش آیا اور اوہو کہتے ہوئے ذرا ہٹ گئے اور سچ پوچھئے تو ہٹنے کے لیے جگہ بھی کہاں تھی، خیال آیا کہ یونیورسٹی جائے جہنم میں اور ایسے مرمر کے جینے سے باز..... جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ لیجئے اب کے ان صاحب کا ہاتھ میرے کلّہ پر پہنچا، یہ حضرت خاک بنگال تھے بنیائن تک اتار کر سوئے تھے ان کی بغل تھی اور میری ناک''۱۱۔

اس افسانے میں ایک زیریں لہر ہے کہ کس طرح کلکتہ جیسے بڑے شہر میں قلیل آمدنی والے لوگوں کے لیے مناسب کرائے کا کمرہ مل جانا کافی مشکل ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے لوگ کسی اور کے ساتھ شریک دار بننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مگر وہ بھی اگر آپ کے مزاج کے برعکس ہوا تو حالات بد سے بدتر ہو جاتے ہیں۔

افسانہ ''موضوع'' مقبول صاحب کے مجموعہ کا چوتھا افسانہ ہے جو مئی ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا۔ اس افسانے میں گاؤں کے ایک شخص کے شہر جانے کی تیاری کی خبر سن کر گاؤں کے مختلف لوگ شہر میں رہنے والے اپنے اپنے رشتے داروں کے لیے تحفے، خطوط اور کھانے پینے کی چیزیں دے کر دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ سردی کے موسم میں تیسرے درجے کے بھیڑ بھاڑ والے ڈبے میں سفر کرنے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ زبان بالکل عام فہم اور سادہ ہے لیکن انداز پیش کش ایسا کہ تیسرے درجے کے ڈبے میں سفر کرنے والے مسافر کی حالت زار کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، قاری کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے ان سارے مناظر کو دیکھ رہا ہے۔ سفر کی یہ تصویر کشی ملاحظہ ہو:

''گاڑی چھوٹ رہی ہے قلی ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے، بگڑ رہا ہے۔ ایک ہاتھ سے میں کیوں کر پیسے نکالوں اور دوں، آخر ایک شخص کی گود میں گھڑی پٹلی اور پیسے

حوالے کئے اب یہاں جنگ کا سامنا! میں نے مجبوری سمجھائی۔ مشکل سے سمجھ میں آئی، خیر مان گئے۔ جائے تنگ است مرد ماں بسیار کی وجہ سے سردی تو سردی پیشانیاں عرق عرق ہورہی ہیں۔ اس طرح جامد وساکت کھڑا ہوں جیسے کسی کو خول اندر کھڑا کردیا گیا ہو۔ مجال نہیں کہ ذرا بھی ہل سکوں جہاں ہاتھ اٹھائے اور کسی کی چندیا سامنے آگئی۔ کھڑے کھڑے ذرا سہارا لینے کو جھکا کہ میری کہنی سے کسی کی ناک لڑگئی۔ چوتھے اسٹیشن پر جنکشن آیا۔ مشکل سے سامان اتارنے کے بعد دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگا'' ۱۲؎

معمولی واقعات کو کیسے کہانی کا موضوع بنانا ہے مقبول صاحب اس سے بخوبی واقف تھے اور اس کی زندہ مثال ان کے یہ افسانے ہیں۔

شاہ مقبول احمد کے افسانوی مجموعہ کا آخری اور پانچواں افسانہ ''زیور'' ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ افسانہ کافی اہم ہے۔ جہاں اس میں ایک عورت کی مصیبت بھری زندگی کی روداد ہے تو وہی اس کا پرعزم حوصلہ بھی۔ افسانہ ''زیور'' اگست ۱۹۴۱ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس افسانہ میں گاؤں کے غریب خاندان کی لڑکی نذریںؔ کی پریشانی اور مصیبت سے بھری زندگی کا ذکر ہوا ہے۔ نذریںؔ گاؤں میں تنہا رہتی ہے اس کی بہن دوسرے گاؤں میں بیاہی ہے جو اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے مگر نذرین اتنی باحوصلہ اور خوددار ہے کہ وہ اپنی بہن کی مدد کو قبول نہیں کرتی اور اپنے بل بوتے پر زندگی گزارتی ہے۔ گاؤں کے لوگ اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ گاؤں کے ہر گھر میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی کام نکل آتا ہے۔ اس کا اپاہج شوہر کلکتے میں رہتا ہے۔ نذریںؔ کی واحد دولت اس کا ایک زیور ہے جسے جب بھی وہ بندھک رکھتی ٹھیک اس کے آٹھ دس دنوں بعد اس کا شوہر گاؤں آجاتا۔ وہ شوہر پرست ہے اور برے سے برے حالات میں بھی اپنے شوہر کے خلاف نازیبا الفاظ پسند نہیں کرتی۔ اس کا مطلبی شوہر جب گاؤں آتا نذریںؔ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔ لیکن نذریںؔ کا وہ اکلوتا زیور چوری ہوجاتا ہے جس سے اس کے گھر میں ماتم کا ماحول پسر جاتا ہے۔ یہ افسانہ بھی حقیقی زندگی سے ماخوذ ہے جس کی تخلیق کے سلسلے میں شاہ مقبول صاحب فرماتے ہیں:

''تعطیل میں مکان گیا تو ایک ایسی قابل رحم خاتون کے حالات سے آشنا ہوا جس کے ناکارہ شوہر نے اس کے سہاگ کو رشک بیوگی بنادیا تھا۔ اس کے باوجود اس

کی والہانہ شوہر پرستی اور اس کے تنہا اثاثۂ حیات ایک زیور کے چوری ہوجانے کا حال معلوم ہوا تو میری نوک قلم سے ''زیور'' جیسا افسانہ اشک خونین بن کر صفحہ قرطاس پر بے اختیار ٹپک پڑا''۱۳۔

اس افسانہ میں نہ صرف ایک مظلوم عورت کا درد ہے بلکہ دیہاتی علاقوں میں شادی بیاہ کے موقع پر جو دھوم رہتی ہے اس کی بھی جھلک اس افسانے میں موجود ہے۔ بہار کے مگہئی علاقے کے رہن سہن اور مختلف کیفیات زندگی کو مقبول صاحب نے پُر اثر طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ اس افسانہ کی زبان بالکل سادہ ہے، جس میں اسی بولی کا استعمال ہوا ہے۔ جیسا بہار کے مگہئی علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ افسانہ ''زیور'' کے متعلق ڈاکٹر شفیع الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

''یہ افسانہ لسانی اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ان میں بہار میں مگہئی علاقوں کے شرفاء وعام لوگوں کے گھروں میں بولی جانے والی زبان کو مقبول صاحب نے افسانہ کا جامہ پہنایا ہے۔ بالفظ اور محفوظ کر دیا ہے۔ صرف زبان ہی نہیں بلکہ زندگی کے مجموعے حادثات ، واقعات اور کیفیات کو پُر اثر انداز میں قلمبند کر دیا ہے تا کہ آنے والی نسلیں اس علاقۂ خاص کی لسانی وتہذیبی اور ثقافتی وراثت سے واقف ہوسکیں''۱۴۔

عورتوں کے جذبات کے اظہار میں یہ افسانہ مقبول صاحب کے تمام افسانوں میں افضل ہے۔ زیور چوری ہونے کے بعد نذیرن کی جو حالت ہوتی ہے ویسی حالت کسی کی سہاگ اجڑ جانے پر ہوسکتی ہے۔ افسانہ کا یہ اقتباس دیکھئے جس میں نذیرن کا درد صاف طور پر عیاں ہے۔

''دوپہر کا سناٹا تھا نذیرن کے گھر سے رونے کی آواز آئی ۔ پڑوس میں عورتیں گئیں، ہائے سر پیٹ رہی تھی زیور چور چلے گئے تھے ۔ بین کر کر کے زار وقطار روتی، کبھی دو ہتر سر پر مار لیتی۔ کبھی خود کو زمین پر دے مارتی، لوٹتی پچھڑ جاتی، عورتیں سہارا دیتیں۔ سمجھاتیں، کوئی ترس کھا کے کہتی کہ ''ہائے غریب کے گھر کی جمنی بڑھی تھی۔ جڑاؤ گہنے بھی اس کے چاندی کے زیوروں کے سامنے گڑ تھے، بہن مثل ہے کہ اپنی دمڑی کے آگے دوسروں کی اشرفی بھی مات ہے''۔ بتول کی

اماں کہتیں بیچاری کیسے نہیں ✧ تڑپے اس کی چہیتی بتول کے بیاہ کی

نشانی تھی۔ زیور رہ جاتے تو یادگار رہتی‘‘......نذیرن روتی ہی چلی جاتی تھی‘‘۱۵؎۔

شاہ مقبول احمد نے جس دور میں افسانے لکھے اس وقت کے افسانے طویل ہوا کرتے تھے جب کہ ان کے مقابلے مقبول صاحب کے افسانے مختصر ہیں، جس کی زبان عام فہم اور بالکل سلیس ہیں۔ ان افسانوں میں جہاں گاؤں کی سادگی اور سکون ہیں تو وہی کلکتہ شہر کا ہجوم، یہاں کی بھاگم بھاگ والی زندگی اور ان تمام حالات سے متاثر ہوتا ایک عام انسان۔شاہ مقبول صاحب نے افسانے کم لکھے جس کے متعلق وہ خود کہتے ہیں کہ ’’مقالہ نگاری کے شوق نے چندے قیام کے بعد اس کوچۂ (افسانہ نگاری) سے بھی مجھے آخری طور پر رخصت کر دیا‘‘۔ بھلے ہی وہ قلیل مدت میں افسانہ نگاری کے میدان سے باہر نکل گئے مگر مغربی بنگال کے افسانہ نگاری کے سفر میں اپنا مقام متعین کر گئے۔ دنیا میں کئی فنکار ایسے ہیں جن کی اکلوتی تخلیق بھی انھیں ایک معیاری مقام عطا کر چکی ہے، جس کی ایک مثال ہم راجندر سنگھ بیدی کی دے سکتے ہیں، جو اپنے ایک ناولٹ ’’ایک چادر میلی سی‘‘ کے ذریعے ناول نگاری کی دنیا میں اپنے لیے ایک اہم مقام بنا گئے، پھر یہاں تو مقبول صاحب کے پانچ افسانے ہیں۔مقبول صاحب کے افسانے اپنے دور کی منھ بولتی تصویریں پیش کرتے ہیں، جس میں اس دور کے سماجی، سیاسی حالات کے علاوہ شہر اور گاؤں کی زندگی کی تضاد کا برمحل اظہار ملتا ہے۔شاہ مقبول صاحب کے افسانوں کے سلسلے میں ڈاکٹر عشرت بیتاب رقم طراز ہیں کہ:

’’ایک فن کار اپنی اکلوتی تخلیق سے بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ یہاں تو پانچ افسانے موجود ہیں، جو بنگال کے افسانوی ادب کے ارتقائی دور کی منہ بولتی تصویر معلوم پڑتے ہیں، جن میں اس دور کے ماحول کی، معاشرے کی، سماجی وسیاسی حالات کی، گاؤں کی، شہر کی اور انسان کی بے بسی کی، افراد کی (بے) راہ روی کی اور بنگال کی بھوکی پیڑھی کی تصویریں نمایاں نظر آتی ہیں‘‘۱۶؎۔

شاہ مقبول صاحب کے افسانے موضوع اور زبان کے لحاظ سے کافی اہم ہیں، کئی ادیب اپنی علمیت کا اظہار کرنے کے لیے گنجلک اور مشکل الفاظ کا استعمال کرکے قاری کو متاثر کرنے کی کوششیں کرتے ہیں جب کہ مقبول صاحب عام زندگی کی باتیں عام الفاظ میں کرتے ہیں۔کردار نگاری کی اگر ہم

بات کریں تو انھوں نے اردو ادب کوکوئی لافانی کردار تونہیں دیا مگران کے افسانوں میں خیالی دنیا کے لوگ نہیں بلکہ ہندوستانی سماج کے عام لوگ ہیں جومختلف رشتوں کونبھاتے نظر آتے ہیں۔ جن میں بیوی، بیٹی، بھائی، بھابھی، دوست احباب نیز دیگر لوگ شامل ہیں، جن کے جذبات کا اظہار مقبول صاحب کے افسانوں میں بخوبی ملتا ہے۔ اگر وہ مسلسل افسانہ لکھتے رہتے تو شاید اردو ادب کوکوئی لافانی کردار دے سکتے تھے۔ کیوں کہ ابتدائی دور کے افسانوں میں ہی ان کا فنی شعور نکھر ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے وقت کے ساتھ اس میں اور جلا پیدا ہوتی۔ مقبول صاحب کے افسانوں میں شوخی وظرافت، نکھرا اسلوب، اشارے کنائے میں تلخ حقیقت کا اظہار اور اس میں معنی کا اتھاہ سمندر موجیں مارتا دیکھائی دیتا ہے۔ ان کا ہر افسانہ زندگی کی کسی نہ کسی حقیقی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ شاہ مقبول احمد کے افسانوی مجموعہ ''پانچ افسانے اور انشائیہ'' کے متعلق سالک لکھنوی رم طراز ہیں کہ:

> ''معاشرے پر طنز کے لیے مکان کی تلاش ریل کے ڈبوں میں لاٹھیوں کا رقص، پیر صاحب اور ان کے جگمگاتی خانقاہ، عرس کی شان وشوکت، قوالی اور لوگوں کی بدحالی، بڑی زمیندار کی نشستوں کا رنگ، گاؤں والوں کی زبوں حالی، شہروں کی بھیڑ بھاڑ، شاہد واحساس اور ان دونوں کے انضمان سے پیدا شدہ، سلیس جملے اس چھوٹی سی کتاب میں کیا کچھ نہیں ہے'' ۱۷۔

گرچہ مقبول صاحب کے افسانوں کا اثاثہ بہت مختصر ہے، لیکن جب بھی بنگال کے افسانوی ادب اور خصوصًا آزادی سے قبل افسانہ نگاروں کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں شاہ مقبول احمد کا نام ضرور لیا جائے گا۔

☆☆☆

بہار میں خواتین اردو افسانہ نگار: ایک تنقیدی مطالعہ
(۱۹۸۰ء کے بعد)

محمد اجمل (دلی یونیورسٹی)

ملخص

اردو افسانے میں صوبہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کی کیا خدمات رہی ہیں؟ گرچہ جواب تفصیل طلب ہے مگر میں نے چند صفحات میں بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کا اجمالی جائزہ لینے کی کوشش کیا ہے۔ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں شکیلہ اختر خشت اول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے بعد کی افسانہ نگاروں میں نصرت آرا، صبوحی طارق، شمیم افزا قمر، رضیہ رعنا، نزہت نوری، قمر جہاں، اشرف جہاں، آشا پربھات، شاہدہ خاتون، نسرین ترنم، تسنیم کوثر، کہکشاں پروین، کہکشاں انجم، تبسم فاطمہ، نزہت طارق، شہناز فاطمی، امتیاز فاطمی، ذکیہ

مشہدی، ثریا جبیں، شہناز بانو اور اعجاز شاہین کے نام خاص طور سے اہم اور قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے افسانوں میں جدیدحسیت اور جدید اسلوب کو بخوبی تلاشا جاسکتا ہے، ساتھ ہی ان کے افسانے ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں صرف جدیدحسیت اور عصری میلانات کی موجودگی ہی نہیں بلکہ روایتی قدروں کا احترام بھی بخوبی ملتا ہے۔ ان کے یہاں متنوع موضوعات کی پیشکش کے ساتھ ساتھ عام فہم زبان کے استعمال پر بھی خصوصی توجہ ملتی ہے۔

☆☆☆☆☆

اردو افسانے کی تاریخ اس بات کا بھی انکشاف کرتی ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے اردو افسانے لکھے جارہے ہیں اور تیسری دہائی سے اردو افسانے کی خدمات انجام دینے میں خواتین کا قلم فعال نظر آتا ہے۔ جہاں تک صوبہ بہار کی بات ہے تو اس سلسلے سے میں یہ عرض کردوں کہ بہار کی اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک سے قبل خاتون افسانہ نگار نظر نہیں آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے اور بہار میں بیسویں صدی کے چوتھی دہائی سے کچھ خواتین افسانہ نگار نے اس صنف میں طبع آزمائی شروع کی، لیکن یہ سلسلہ آزادی کے بعد ہی پوری طرح قائم ہوسکا۔ اس کی اہم وجہ کے سلسلے سے ڈاکٹر قیام نیر فرماتے ہیں:

> ''اس کی سب سے بڑی وجہ مسلم معاشرے کی مذہبی سخت گیری تھی۔ عورتوں کو گھریلو اور دینی تعلیم کے علاوہ دوسری قسم کی تعلیم دلوانا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پردے کی پابندیوں کی وجہ سے عورتوں کے لئے گھر کی چاردیواری سے باہر کی دنیا شجر ممنوعہ تھی۔ عورتوں کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ساری زندگی گھر کے ایک ہی کھونٹے سے بندھی رہتی ہیں، لیکن نئی تہذیب اور نئی روشنی کی رہنمائی میں کچھ خواتین نے گھر سے باہر قدم نکالا اور

اپنے اردگرد کی دنیا کو دیکھا۔ اس کے بارے میں غور وفکر کیا۔
اونچی تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ دنیا کی تاریخ دنیا کے جغرافیائی
حالات دنیا کی مختلف تہذیب وتمدن اور معاشرے کو سمجھا۔'' (۱)

۱۹۶۰ء کے بعد بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد یہ سلسلہ اور زیادہ مستحکم ہوا اور ۱۹۸۰ء کے بعد متعدد خواتین افسانہ نگار سامنے آئیں جو نہ صرف مردوں کے شانہ بہ شانہ چلیں بلکہ ان میں سے کچھ کے کارنامے تو مردوں سے بھی زیادہ ہیں۔

جب ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ فکشن کی بنیاد قصہ طرازی پر ہے۔ ایسی کہانی پر ہے جو طبع زاد ہو اور اپنے ذہن کی اختراع ہو۔ اس سلسلے میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فکشن نویسی ایک ایسا آرٹ ہے جہاں خارجی حقائق بھی اس طرح بیان ہوتے ہیں جن پر ماورائے حقیقت کا گمان ہو یا اختراعی کہانی پر بھی حقیقت کا شائبہ ہونے لگے۔ مطلب یہ کہ حقیقت پر افسانے اور افسانے پر حقیقت کا دھوکہ پیدا کرنا فن کار کے اظہار کی مہارت کا متقاضی ہے۔ افسانہ نگاری کے لئے تخیل کی غیر معمولی توانائی کی ضرورت ہے۔ افسانہ نویسی اور خواتین کے درمیان کتنا گہرا رشتہ ہے اس سلسلے سے پروفیسر علیم اللہ حالی رقم طراز ہیں:

''کہانی سنانا یا کہانی بنانا یوں بھی ایک مشکل کام ہے۔ بلاشبہ یہ کام اس وقت ممکن ہے جب کہانی سنانے والا اختراعی قوت کا حامل بھی ہو اور وہ اپنی کہانی کو ادب کا مقام عطا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ مرد اساس معاشرے میں مردوں نے ٹھوس مشکل اور دشوار مسائل اپنے سر لے لئے اور معاشرے کو مادی اعتبار سے آگے بڑھانے میں زیادہ مستعدی دکھائی اس کے نتیجے میں تخیلی تصوراتی اور تفریحی ونفسیاتی ارتفاع وتکسین کے امور کا ایک بڑا حصہ خواتین کے ذمے آ گیا۔ تعلیم کے فروغ اور دانش کے ارتقا کے ساتھ ساتھ خواتین کی یہ بنیادی اہمیت ادب کی سرحد میں بھی پہنچنے لگی۔ اردو کے افسانوی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اپنی آبادی اور تعلیم کے تناسب سے خواتین نے فکشن ادب کی توسیع میں

نمایاں فریضہ انجام دیا ہے۔'' (۲)

یہ حقیقت ہے کہ ابتدا میں خواتین نے Intellect سے زیادہ Interest پر توجہ دی کیوں کہ اس عہد میں ادب کا تقاضا بھی یہی تھا، لیکن رفتہ رفتہ خواتین کی افسانہ نگاری تعمیری اور اصلاحی سمت کی طرف بڑھتا گیا۔ ایسی نسوانی کرداروں کی پیشکش پر توجہ دی گئی جن سے عبرت حاصل کی جا سکے۔ بے راہ روی کی شکار نسوانی کرداروں کو پیش کرنے سے اجتناب کیا گیا۔ مختصر یہ کہ صابر و شاکر عورتوں کو افسانے کا کردار بنایا گیا۔ اس طرح خواتین کے ذریعہ تحریر کردہ افسانوں کی بڑی تعداد ہمارے سامنے موجود ہے۔ جہاں تک بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کی بات ہے تو اس بابت یہ کہا جائے گا کہ صوبہ بہار کی خواتین افسانہ نگار کے افسانے ہر اعتبار سے اپنی اہمیت منوانے میں کامیاب رہے۔

انفرادی طور پر بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کی بات کروں تو نسرین ترنم کی کہانیوں میں بعض اشاراتی جملے اور استعارے ہمارے دل کو متاثر کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں فن کا بہت خوب مظاہرہ کیا ہے، ان کے افسانے تکنیکی اعتبار سے مکمل اور مربوط ہوتے ہیں۔ عصمت آرا کی بات کریں تو ''درد کا رشتہ'' اور ''داغ'' ان کا مشہور افسانہ ہے۔ یہاں ماجرا نگاری بہت خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ دیگر افسانوں میں بھی زماں و مکاں سے مطابقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیانیہ انداز بیان میں تحریر کردہ آپ کے افسانے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

نزہت نوری، شمیم صادقہ، صبوحی طارق اور نزہت پروین کیا فسانوں کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام خواتین افسانہ نگار علامتی اور تجریدی افسانے لکھتی ہیں۔ عصری حسیت اور جدید اسلوب کی بنا پر انہوں نے اپنی شناخت بنانے میں کامیابی پائی ہے۔ نزہت نوری تو سب پر سبقت لے جاتی ہیں، آپ کا فن زیادہ پختہ نظر آتا ہے۔ ان کے بعد تسنیم کوثر، عنبری رحمان، کہکشاں انجم، کہکشاں پروین، نصرت آرا، تبسم فاطمہ ایسی فنکارہ ہیں جن کا فنی رچاؤ اور پیشکش کی تازگی ان کے روشن مستقبل کی غمازی کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ صوبہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں زندگی کے مختلف شیڈس نظر آتے ہیں۔ ہجرت، نفسیات، جنس، رشتوں کی کشاکش، دلی حسرت، کوشش ناتمام، معاشی و

معاشرتی پیچیدگیاں ،فساد اور تہذیب و ثقافت کے گوناگوں مسائل ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔اس اختصاص کے ساتھ کہ ان میں نسائی فکر کی نرمی اور حلاوت اور اظہار کی شیفتگی موجود ہے۔ان کے یہاں احتجاجی مسائل ومعاملات بھی شعلہ بداماں لہجے میں بیان نہیں ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ یہ موضوعات ان کے یہاں زیادہ دل نشیں بن جاتے ہیں۔

ہم اس بات سے بھی آشنا ہیں کہ افسانہ کا مقصد تعمیری ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ افسانہ زندگی کی تفسیر ہے۔افسانہ نگار اپنے فن کی بنیاد پر انسانی زندگی کو خوشگوار بنانا چاہتا ہے۔اسی لئے اس کا مقصد تعمیری ہوتا ہے۔مرکزی خیال کی پیشکش کے لئے وہ کرداروں کو خلق کرتا ہے۔یہ کردار اعمال اور افعال کے سہارے افسانہ نگار کے خیالات کی پیشکش کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے موضوعات کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔کیوں کہ یہاں عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے کے حوالے سے ہمیں کسی طرح کی کمی نہیں دکھائی دیتی ہے۔سلام سندیلوی کے اس نظریے کے اعتبار سے خواتین افسانہ نگار کامیاب نظر آتی ہیں ملاحظہ کیجئے.....

> ''موضوعات کی تلاش کے لئے مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔جس قدر افسانہ نگار کا مشاہدہ تیز ہوگا اسی قدر عجلت کے ساتھ وہ موضوعات کو تلاش کرلے گا۔مشاہدہ کے علاوہ موضوعات کی تلاش میں کتب کا مطالعہ بھی مدد دیتا ہے۔''(۳)

لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کے پاس مشاہدے کی کمی نہیں ہے۔ تعلیم کی بھی کمی نہیں ہے۔اس لئے موضوع اور مواد دونوں اعتبار سے ان کے افسانے کامیاب ہیں۔ذکیہ مشہدی ماہر نفسیات ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں طوائفوں کی زندگی کے مسائل پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔قمر جہاں نے عہد رفتہ اور عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔شمیم افزا قمر نے مسلم معاشرے کو موضوع بنایا ہے۔اشرف جہاں نے بھی عورتوں کے مسائل کو ہی موضوع بنایا ہے۔شناخت، ناتمام محبت اس سلسلے سے بہترین افسانے ہیں۔نزہت پروین نے گھریلو زندگی کو موضوع بنایا ہے۔شہناز بانو نے عورتوں اور لڑکیوں کی محرومی کو افسانے کا حصہ بنایا ہے۔اس طرح بہار کی خواتین افسانہ نگاروں نے گوناگوں موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

اسلوب کے حوالے سے بھی ان کے افسانے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔خواتین افسانہ نگاروں کے اسلوب کے ذکر سے قبل اسلوب کیا ہے؟اس سلسلے سے سلام سندیلوی کا یہ قول ملاحظہ کیجئے:

''جس طرح ہر مصنف کے خیالات اور احساسات جداگانہ ہوتے ہیں اسی طرح اس کی زبان بھی علیحدہ ہوتی ہے۔یہی اس کا اسلوب ہے۔اس کا اسلوب اس سے جدا نہیں ہوسکتا بلکہ سایہ کی طرح ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔اس کے جذبات کے ہجوم خیالات کا تسلسل تقابلی انداز اور قوت تمیز سب سے الگ ہوتی ہے۔اس کا مزاج،اس کا ذوق اور اس کا عمق ایک نئے انداز سے نمودار ہوتا ہے اور یہی سب باتیں مل کر اس کے اسلوب کی تعمیر کرتی ہیں۔''(۴)

ہر فنکار کا اسلوب منفرد ہوتا ہے یہاں کسی کی تقلید نہیں کی جاسکتی۔افسانے میں بھی اسلوب کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔اس سلسلے سے ڈاکٹر قیام نیر فرماتے ہیں:

''افسانے میں اسلوب کی بہت اہمیت ہے۔اسلوب کو کسی بھی ادب سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ادب کے مطالعہ کا ایک اہم پہلو ادیب کے اسلوب کے مطالعہ اور جائزے سے تعلق رکھتا ہے۔بعض مصنف فقروں اور جملوں کو چست بناتے ہیں۔بعض استعاروں تشبیہوں اور کنایوں سے کام لیتے ہیں۔بعض کے کہنے میں صفائی،سادگی اور روانی ہوتی ہے بعض ادیب رنگین بیانی کا سہارا لیتے ہیں بعض کے یہاں بوجھل،پیچیدہ اور ثقیل الفاظ ملتے ہیں کسی کی تحریر میں شوخی ہوتی ہے۔مختصر یہ کہ افسانے میں اسلوب کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔''(۵)

بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے اسلوب اور زبان و بیان کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔کہکشاں انجم اپنے حسین اسلوب کے ذریعہ ایسی دنیا تعمیر کرتی ہیں کہ قاری ان کی افسانوی سحر میں کھوکر رہ جاتا ہے۔تسنیم کوثر اظہار بیان اور جملوں کی ساخت و ترتیب میں الگ انداز رکھتی ہیں۔صبوحی طارق کے افسانوں میں شروع سے آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔اس کا راز

ان کا خاص اسلوب اور انداز بیان ہے۔ کہکشاں پروین اپنے افسانوں کو موثر بنانے کے لئے صاف ستھری زبان اور ایک خاص اسلوب استعمال کرتی ہیں۔تبسم فاطمہ سیدھا سادہ بیانیہ اسلوب استعمال کرتی ہیں۔ ان کے اسلوب میں ان کی شخصیت کی جھلک صاف طور سے دیکھی جاسکتی ہ ے۔نسرین ترنم اور عنبری رحمان کی عبارت میں روانی دیکھنے کو ملتی ہے۔نصرت آرا اور نوشابہ خاتون کا اسلوب ان کے گہرے مشاہدے تجربے اور جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔اس طرح یہ کہا جائے گا کہ مذکورہ بالا تمام افسانہ نگاروں کو اسلوب بیان کے حوالے سے ادبی دنیا میں گراں قدر اہمیت حاصل ہے۔ان کے افسانوں میں اسلوب کے اعتبار سے کسی طرح کی کمی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ مذکورہ بالا خواتین افسانہ نگاروں کی زبان اور اسلوب ایسا سماں باندھ دیتے ہیں کہ پڑھنے والا نہ صرف اس میں ڈوب کر رہ جاتا ہے بلکہ ان کے افسانوں کو بھی منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ان کی کہانیوں میں ربط وتسلسل اس طرح قائم رہتا ہے کہ قاری پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اول سے آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔کہکشاں انجم کے حوالے سے ایک اقتباس دیکھئے:

> ''کرچیاں کے عنوان سے جو افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے اس کی زیادہ تر کہانیاں عورتوں کے مسائل کو پیش کرتی ہیں۔ان کہانیوں کو موثر بنانے کے لئے انہوں نے صاف ستھری زبان اور خاص اسلوب استعمال کیا ہے۔ روزمرہ استعمال ہونے والے محاورے اور ضرب المثل نے ان کی کہانیوں کو مقبول بنادیا ہے۔عورتوں کے جذبات کی عکاسی کرنے میں ان کا خاص اسلوب قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔''(۶)

نصرت آرا کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے:

> ''نصرت آرا کا نام افسانوی ادب میں بڑے ہی عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔''دردکا رشتہ'' کے نام سے ان کا ایک افسانوی مجموعہ ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہو چکا ہے۔ان کے افسانوں میں مشرقی تہذیب وتمدن کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ دراصل وہ مشرقی ماحول کی دلدادہ ہیں۔ازدواجی رشتے کی مختلف صورتوں کو انہوں نے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔کم عمری کی شادی

جہیز کی لین دین اور اس کے بھیانک انجام کو موضوع بنایا ہے۔ کردار نگاری اور ماجرا نگاری کے ساتھ ساتھ سراپا نگاری میں وہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے بہت آگے ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔''(۷)

صبوحی طارق کے حوالے سے ڈاکٹر رخسانہ جمیل فرماتی ہیں:

''صبوحی طارق بہار کی مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں۔ درد کا گلاب ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو آج بھی قارئین کے دلوں میں اپنی جگہ بنائے ہوئے ہے۔ زبان و بیان پر فوقیت حاصل ہونے کی وجہ سے ان کے افسانے بے حد مقبول ہیں۔''(۸)

نسرین ترنم کے حوالے سے یہ اقتباس دیکھئے جن کے ذریعہ ان کے اسلوب بیان کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''وہ مشاہدے کی دولت سے لبریز ہیں۔ ماجرا سازی اسلوب نگارش اور پیشکش کا انداز اچھا ہوتا ہے۔ وہ ہلکی پھلکی زبان استعمال کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں سماج اور فرد پر زمانے کی پرچھائیاں ہیں۔ چھوٹے کینوس پر انہوں نے بڑی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔''(۹)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو ایک نئی سمت و رفتار عطا کی ہے۔ افسانے کی آبیاری میں مذکورہ بالا تمام خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے قلم کو رواں رکھا ہے۔

☆☆☆

اسلم پرویز اسلم بحیثیت رباعی گو

خوشبو پروین
ریسرچ اسکالر، حیدرآباد یونی ورسٹی

ملخص

غزل کے علاوہ دیگر اصناف شاعری کی جانب ہر زمانے میں بہت ہی کم افراد نے توجہ دی ہے۔قصیدہ و مرثیہ کا عروج ہوا اور زوال بھی، رباعی بھی اپنے عروج کو پہنچتی ہے اور دنیا میں چھا جاتی ہے لیکن اس صنف سخن میں افسوس کے ساتھ خوشی بھی ہے۔افسوس یہ کہ بہت کم شاعروں نے اس صنف کی جانب توجہ دی اور خوشی اس بات کی ہے کہ ہر زمانہ میں رباعی لکھی جاتی رہی ہے۔اردو میں دکنی دور سے بیسویں صدی تک رباعی کے شاعر ملتے ہیں اور اکیسویں صدی کی شروعات میں

اس جانب نوجوانوں کی رغبت خصوصی طور پر نظر آتی ہے۔ ان ہی میں سے ایک اسلم پرویز ہیں جنہوں نے غزل کے بجائے اظہار بیان کے لیے رباعی کو ہی فوقیت دی اور ''پرواز'' کے نام سے رباعیوں کا مجموعہ بھی منظر عام پر لائے۔ شمس الرحمان فاروقی سے لے کر پروفیسر طلحہ رضوی برق تک نے عمدہ رباعیوں کے لیے انہیں سراہا اور مستقبل کے لیے نیک خواہشات بھی پیش کیں۔ ان کی رباعیوں میں جہاں عمدہ اسلوب پایا جاتا ہے وہیں وہ قاری کے ذہن میں فکر کے دریچے وا کر جاتے ہیں۔ ان کے یہاں متنوع موضوعات پر رباعیاں ملتی ہیں وہیں شخصی رباعیاں بھی کثیر تعداد میں کہی ہیں۔ جہاں تک فن کی بات ہے تو انہوں نے چوبیس مروجہ بحروں میں زیادہ تر رباعیاں دو اوزان (مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعل اور مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فع) میں تخلیق کی ہیں۔

☆☆☆☆☆

رباعی گو اسلم پرویز ملک کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں۔ انہوں نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن جلد ہی رباعی کی طرف مائل ہو گئے۔ اسلم پرویز ایک اچھے رباعی گو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخلص انسان بھی ہیں۔ ان کی یہی صفت انہیں دوسروں سے منفرد پہچان دلاتی ہے۔ لہٰذا اردو ادب کی تاریخ اور اس کی موجودہ صورت حال پر بھی ان کی نظر رہتی ہے۔ صنف رباعی سے انہیں خاص رغبت ہے اور انہوں نے اپنی شاعری کی اساس بھی کل طور پر صنف رباعی گو ہی رکھی ہے لیکن چونکہ اردو شاعری کا دامن غزل سے بندھا ہوا ہے۔ اسی لئے شاید موصوف نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ عام طور پر رباعی کو مشکل صنف کہا جاتا ہے لیکن موصوف نے نہ صرف رباعیاں کہیں بلکہ بہت کم عرصے میں بہت سی رباعیاں تخلیق کیں جس کا احساس شاید موصوف کو بھی ہوا۔ اسی لئے انہوں نے اپنی ایک رباعی میں اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ہے:

ناچیز پہ احسان کیا ہے تو نے
اس فن کو جو آسان کیا ہے تو نے
میں اور کہاں صنف رباعی اللہ
شہرت کا یہ سامان کیا ہے تو نے

حضرت ابرا حسنی گنوری مرحوم کی طرح اسلم پرویز نے بھی رباعی کو غزل پر فوقیت دی ہے اور اس طرح سے اپنی ایک رباعی میں اس کا اظہار کرتے ہیں

جوہی سے چنبیلی سے کنول سے بہتر
مرمر سے بنے تاج محل سے بہتر
اوصاف تجھے اس کے بتاؤں میں کیا
اچھی ہو رباعی تو غزل سے بہتر

اس امر کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل سے شاعر کی وابستگی کم نہیں ہوئی ہے۔اس صنف کی چھلک آج بھی ان کی رباعیوں میں مختلف شکلوں میں نظر آتی ہے:

جذبات کے ساغر میں ڈبوتی ہے غزل
دن رات میرے ساتھ ہی ہوتی ہے غزل
مشکل ہے کہ اب دور رہے یہ مجھ سے
سنتا ہوں میرے عشق میں روتی ہے غزل

بچپن کی کہانی بھی سناتی ہے غزل
ایام جوانی بھی دکھاتی ہے غزل
یہ صنف ہے یا آئینہ خانہ ہے کوئی
ماضی کی بہت یاد دلاتی ہے غزل

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ رباعی ایک مشکل صنف سخن ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے مجید بیدار نے اسلم پرویز کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس انداز میں کیا ہے کہ:

''اردو کے چند گنے چنے نوجوان اور ابھرتے ہوئے شاعروں میں اسلم پرویز کا شمار ہوتا ہے اردو کی سب سے دشوار صنف اور شاعری سے مشاہدہ کے علاوہ ریاضت کا تقاضا رکھنے والی صنف شاعری یعنی رباعی کو اپنی شعر گوئی کے

لئے منتخب کر کے اسلم پرویز نے خیالات اور تجربات کی ایک نئی دنیا
اپنے شعری مجموعہ 'پرواز' میں سجائی ہے۔''

اسلم پرویز کے اشعار کی ایک بڑی خوبی ان کے مصرعوں کی روانی ہے جس کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے:

نازک ہے تیرا جسم گل تر کی طرح
ہے حسن کسی نوری پیکر کی طرح
ابرو سر محراب حرم کی مانند
بو زلفِ پریشاں کی ہے عنبر کی طرح

محلوں کے مکینوں کو کوئی فکر نہیں
ان ماہ جبیوں کو کوئی فکر نہیں
سب فکر جہاں صرف ہماری خاطر
بے فکر حسینوں کو کوئی فکر نہیں

ایسا نہیں ہے کہ نوجوان شاعر ہمیشہ فقط حدیث دل سے الجھتے رہے ہیں ان کے مجموعۂ کلام 'پرواز' میں بے شمار موضوعات کی رنگا رنگی ہے۔ موصوف نے بھی اس کا ذکر کیا ہے:

ارمان سے حسرت سے امنگوں سے بھری
امید کی پرجوش ترنگوں سے بھری
خوش رنگ بہت سے میر ی فکر امروز
ہے ساری رباعی میری رنگوں سے بھری

یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ اردو شاعری کی کتابیں اکثر حمد ونعت سے شروع کرنے کی روایت بڑی پختہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کی تہذیب ہے لیکن رسماً کی گئی باتوں میں وہ تاثیر، جذبہ اور وہ خوشبو نہیں ہوتی جو دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی باتوں میں ہوتی ہے اور اسلم صاحب کی رباعیاں ان کے صالح العقیدہ ہونے کی غمازی کرتی ہے:

پتھر کا خدا کس کو کیا دیتا ہے
اللہ طلب سے بھی سوا دیتا ہے
کیوں مانگوں کسی اور سے قطرہ اسلم
بھر بھر کے مجھے جام خدا دیتا ہے

اور یہ بھی حق بجانب ہے کہ جہاں اللہ رب العالمین کا نام ہو وہاں محمد رسول اللہ کا ذکر نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں:

محراب میں زینے میں رہوں گا جا کر
رحمت کے سفینے میں رہوں گا جا کر
انساں سے کوئی مجھ کو بنادے جو پرند
اسلم میں مدینے میں رہوں گا جا کر

اسلم پرویز سے متعلق ماہر نفسیات اور ماہر عروض فن پروفیسر عظیم الرحمٰن کی رائے یہ ہے کہ:

''اسلم پروفیسر اردو کا سب سے کم عمر رباعی گو شاعر ہی نہیں بلکہ اردو شعر و ادب کا ایک مستقل ادارہ ہے۔ اخلاقیات اور ایمانیات کے میدان میں ایک قندیل رہبانی ہے۔ اتنی کم عمری میں ایسا روشن ستارہ کم ہی نمودار ہوتا ہے۔''

اسلم پرویز کی رباعیوں میں تمام موضوعات، مضامین احساسات، جذبات و کیفیات کو نظم کیا گیا ہے جس کو ممکن ہے کہ کوئی دوسرا شاعر غزل یا نظم میں پیش کرتا۔ سیاست کے گروہ بندی پر بھی انہوں نے اپنی برہمی دکھائی ہے اور ان بدنی جذبوں کا اظہار بھی کیا ہے جو شاعر میں آلائش سے پاک ایک ملکوتی رشتے میں ڈھلا نظر آتا ہے:

اک آگ کی مانند بھڑکتا ہے بدن
رہ رہ کے بدن کو ہی لپکتا ہے بدن
یہ راز بھی اک راست کھلا تھا مجھ پر
خوشبو سے زیادہ بھی مہکتا ہے بدن

ایوان جہاں کانپ رہا ہے دیکھو
اوسان یہاں کانپ رہا ہے دیکھو
پھر کوئی غلط فیصلہ آیا شاید
انصاف میاں کانپ رہا ہے دیکھو

اب جھوٹ سے نفرت سے الگ رکھنا ہے
اس طرز تجارت سے الگ رکھنا ہے
بھائی مری مسجد ہو کہ مندر ہو تیرا
منحوس سیاست سے الگ رکھنا ہے

انداز فسادات بدل جائیں گے
اس شہر کے حالات بدل جائیں گے
ہم آپ اگر مل کے کریں کام شروع
نفرت کے مکانات بدل جائیں گے

اسلم پرویز کی رباعیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر رباعیاں تخلیق کی ہیں۔ جہاں تک فن کا سوال ہے اسلم پرویز نے رباعی کے مقررہ ومروجہ صرف دو اوزان مفعول ،مفاعیل، مفاعیل، فعل اور مفعول، مفاعیل، مفاعیل فع میں زیادہ تر رباعیاں تخلیق کی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ رباعی کے چوبیس اوزان میں یہ دونوں زیادہ غنائیت کے حامل ہیں۔ عام طور پر رباعی کا سب سے مشکل وزن مفعولن، مفعولن، مفعولن فع ہے۔ اس وزن میں بھی اسلم پرویز کے یہاں چند خوبصورت رباعیاں ملتی ہیں:

اب تو میرے اندر کھوجاؤ تم
میرے دل میں چھپ کر سوجاؤ تم
اک دن قطرے سے یہ سیپی بولی

آؤ کچھ تو مہنگے ہو جاؤ تم

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلم پرویز کو رباعی کے فن پر مکمل دسترس حاصل ہے جیسا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ان کی رباعیوں کے مجموعے 'پرواز' کے سلسلے میں اپنی رائے پیش کی ہے:

''نظموں اور غزلوں کی بھیڑ میں آپ نے رباعی کی طرف توجہ کی آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب ارباب فن میں پسند کی جائے گی۔''

اسلم پرویز کی رباعیوں کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے ملک کے مشاہیر ادیبوں پر متعدد رباعیاں تخلیق کی ہیں اور ان شخصی رباعیوں کے ذریعہ شاعر نے اپنے پسندیدہ ادیب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ عام طور پر نظموں کے موضوعاتی پھیلاؤ کی وجہ سے اس صنف میں کسی شخص یا شخصیت کے اوصاف بیان کرنا عام بات ہے۔ اردو ادب میں ایسی نظموں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف رباعی جیسی مشکل صنف میں کسی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا انتہائی مشکل صنف ہے لیکن اسلم پرویز کے رباعیوں کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی کامیابی کے ساتھ شمس الرحمٰن فاروقی، سیدہ جعفر، ناوک حمزہ پوری، سید امیر اشرف، جیلانی بانو، خورشید اکرم جیسی اعلیٰ شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کو اپنی رباعیوں کے ذریعہ بخوبی اجاگر کیا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلم پرویز کو صنف رباعی سے فطری لگاؤ ہے اور وہ اس صنف پر مکمل دسترس بھی رکھتے ہیں:

سیدہ جعفر کے نام

تحقیق کے گلشن میں گل تر ہیں وہ
ہر علم کی خوشبو سے معطر ہیں وہ
وہ کون ہیں اب جن کی مہک ہے ہر سو
خاتون دکن سیدہ جعفر ہیں وہ

شمس الرحمٰن فاروقی کے نام

تنقید میں تحقیق میں معروف ہیں وہ
اردو کی محبت ہی میں مصروف ہیں وہ
فاروقی کا میں حاشیہ بردار نہیں

ناچیز کے ممدوح ہیں ❁ موصوف ہیں وہ

سید امین اشرف کے نام

خوشبوئے تغزل سے معطر تھے امین
دادِ دلِ محزوں کے سخنور تھے امین
مداح یہاں اب بھی بہت ہیں ان کے
گلشن میں شعرا کے گل تر تھے امین

ناوک حمزہ پوری کے نام

پابند شریعت ہیں ناوک صاحب
اک زندہ کرامت ہیں ناوک صاحب
ہر اہل ادب کے بے چون چرا
اللہ کی رحمت ہیں ناوک صاحب

جیلانی بانو کے نام

ہر ایک کا مقصود ہے ایوان غزل
ہر حال میں محمود ہے ایوان غزل
ناول میں تیرے ایسا اثر ہے بانو
ہر ذہن میں موجود ہے ایوان غزل

میرے خیال میں اسلم پرویز کی رباعی گوئی یا شاعری کے سلسلے میں معروف ادیب علیم اللہ حالی کی رائے حقیقت پر مبنی ہے:

''اردو کی موجودہ ادبی نسل میں اسلم پرویز کی شخصیت کئی حیثیتوں سے نمایاں ہیں.....محمد اسلم پرویز نے رباعی میں موضوعات ومحسوسات کے اعتبار سے بھی نئے اور کامیاب تجربات کئے ہیں۔عصر حاضر کے نئے مسائل اور متعدد ان کہے جذبات کی وجہ سے اسلم پرویز کی رباعیاں نہ صرف ان کی غیر معمولی تخلیق کا اظہاریہ ہیں بلکہ ان سے اس صنف شاعری کے نئے امکانات کے دروازے بھی

کھلتے ہیں۔ پرانی فنی ہیئتوں میں ﴿ جدید تر موضوعات ومحسوسات کی
دلکش پیشکش اسلم پرویز کی اصیل اور منفرد تخلیقی شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ ان
کی کامیاب کاوش اہل قلم حضرات کو تخلیق کے وسیع تر امکانات سے روشناس کراتی
ہے اور یہ ایقان عطا کرتی ہے کہ 'سب جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے'۔''

اسلم پرویز کی رباعیوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیشتر رباعیوں میں بھرپور وحدت تاثر ہے جو رباعی کا وصف خاص ہے۔ زبان وبیان سادہ، دلکش اور سلیس ہے۔ اسلوب میں نیاپن ہے اور ایسی کئی خوبیاں اور بھی ہیں جو اسلم پرویز کو نوجوان رباعی گو شعرا میں ایک مقام عطا کرتی ہیں۔ ایک ایسے شہر میں جہاں کوئی اور شاعر رباعی نہ کہتا ہو وہاں صرف اسلم پرویز کا رباعی کے آنگن میں چراغ روشن کرنا انتہائی قابل تعریف، لائق تحسین اور قابل رشک ہے۔

☆☆☆

احتشام حسین کی افسانہ نگاری

کشف الدجیٰ، ریسرچ اسکالر
ایل۔ این۔ ایم۔ یو، دربھنگہ بہار

ملخص

افسانہ انسان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ اپنی اجتماعی زندگی کے ابتدائی دور سے ہی کہانی کہنا اور سننا انسان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ ابتدائی عہد میں داستانیں وقت گزارنے کا اہم وسیلہ بنیں رہیں، لیکن رفتہ رفتہ حقیقت پسندی کو دخل حاصل ہونے لگا اور اس طرح اردو ناول نے جنم لیا، لیکن اردو ناول کے بعد ایک ایسی صنف کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم وقفے میں زندگی

کی اصل حقیقت سے روبرو کرانے میں کامیاب ہو۔ اس طرح افسانوں کے اختراع پسند ذہن نے اسی ناول کے باطن سے اپنی کہانی برآمد کرلی جو زندگی کے مخصوص پہلو، مخصوص حادثے یا مخصوص احساس کی ترجمانی ثابت ہوئیں اور مختصر افسانے کے نام سے موسوم ہوئیں۔

☆☆☆☆☆

اردو افسانہ پریم چند سے قبل اور پریم چند کے بعد کے عہد سے لے کر اب تک اپنی اہمیت کا لوہا منواتا رہا ہے۔ ہر عہد میں افسانوی منظرنامے پر اہم دستخط انفرادیت کا ثبوت ڈالتے رہے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ کہانیاں قارئین ادب کو مرعوب کرتی رہی ہیں۔ اردو افسانہ کے سلسلے سے وقار عظیم کا یہ قول ملاحظہ کیجئے:

> افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا۔ کسی ایک واقعہ، ایک جذبہ، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ دوسری چیزوں سے الگ نمایاں ہو کہ پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا۔''

داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص-۱۶

یہ حقیقت ہے کہ احتشام حسین کی اصل شناخت بحیثیت نقاد زیادہ مشہور و معروف ہے، لیکن بحیثیت افسانہ نگار بھی آپ کے ادبی حلقے میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ ''ویرانے'' آپ کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں کل ۱۶ افسانے ہیں۔ رجونتی، ایثار، قطرے میں طوفان، دوسرا نکاح، مجبوریاں، اس کا بچہ اور بیزاری ان کے بہترین افسانے ہیں۔ آپ کا افسانوی سفر اس وقت شروع ہوتا ہے جب رومانیت انگڑائی لے رہی تھی۔ افسانوں میں خواب و خیال کی دنیا آباد کرنے پر توجہ دی جارہی تھی کیوں کہ اس وقت سانحہ تقسیم ہند سامنے نہیں آیا تھا۔ افسانہ نگاری کے سلسلے سے احتشام حسین خود فرماتے ہیں:

> ''میں داخلی حقیقتوں کا منکر نہیں ہوں، لیکن جانتا ہوں داخلی حقیقتیں خارجی

حقیقتوں کا عکس ہوتی ہیں۔اس لئے داخلی حقیقتوں کا اس طرح بیان کہ ان کا تعلق خارجی حقیقتوں سے زیادہ نہ ہو میرے خیال میں حقیقت نہیں ہے۔''

ویرانے، احتشام حسین، دیباچہ

آپ کے افسانوں میں متنوع موضوعات کی پیشکش پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔طبقاتی کشمکش، جنس، سماجی بندشیں، احساس مسائل آپ کے افسانوں میں تلاشے جاسکتے ہیں۔

آپ کے افسانوں میں بغاوت کی چنگاری کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلے سے افسانہ ''دوسرا نکاح'' اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔''حرارت'' میں بھی سماجی بندشوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے۔اس سلسلے سے افسانوی کردار کلوا قارئین کو کافی متاثر کرتا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ احتشام حسین کا عہد رومانیت کا عہد تھا۔رومانی افسانے بڑی تعداد میں لکھے جارہے تھے، لیکن اس کے برعکس احتشام حسین کے افسانوں کے موضوعات سماج کے سلگتے ہوئے مسائل تھے۔اس سلسلے سے عابد سہیل فرماتے ہیں:

''احتشام حسین کے افسانوں کی تعداد بے حد مختصر ہے، لیکن یہ افسانہ اس بات کی نشاندہی ضرور کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے افسانہ نگاری ترک نہ کی ہوتی تو اردو افسانہ کو اس قدر کم مالا مال نہ کرتے جتنا انہوں نے تنقید کو کیا۔''

ماہنامہ آج کل، نئی دہلی، مارچ ۱۹۸۳ء

احتشام حسین نے افسانے اندرونی ارج کی بنا پر تخلیق کیا ہے۔جس میں داخلی حقیقتیں خارجی حقیقتوں کے زیر نگیں ہیں جن میں دلکشی کا خیال رکھا گیا ہے خارجی حقیقتیں جنگ اور ہندوستان کا جمود ہیں۔مختصر یہ کہ اردو افسانے کو ایک نئی معنویت عطا کرنے میں احتشام حسین کے افسانے معاون و مددگار نظر آتے ہیں۔ہم اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ احتشام حسین مقصدی ادب کے قائل ہیں وہ تخلیق کی بلندی مقصد کی تکمیل کو قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک مقصد کے بغیر کوئی اعلیٰ تخلیق ناممکن ہے اور عدم مقصدیت ایک طرح کا فریب ہے۔آپ ترقی پسند خیالات کو مادی اور سماجی شعور کے انسانی اعمال کی توضیح کی بنیاد بنا کر سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقے کی تصویر کھینچتے ہیں اور ان کی ذہنی

کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی لئے آپ کے یہاں کرداری افسانے کم اور واقعاتی افسانے زیادہ ملتے ہیں۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے:

''احتشام حسین نے جن چار اجزائے ترکیبی پر اپنے دیباچہ میں زور دیا ہے وہ ذہنی تحریک اختصار خارجی حقیقت نگاری اور افسانوی دلکشی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ چار عناصر کسی افسانہ کے بنیادی اجزاء نہیں، لیکن موضوع کے انتخاب میں مہارت پلاٹ پر فنی گرفت کردار کی عمدہ پیشکش دلکش اسلوب بیان اور تکنیک میں توازن سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔''

احتشام حسین کی تخلیقی نگارشات ایک مطالعہ، ڈاکٹر شہزاد انجم، ص-۱۷۷

اس طرح یہ کہا جائے گا کہ احتشام حسین حقیقت پسند فنکار ہیں۔انسانی مسائل پر آپ کی گہری نگاہ رہتی ہے۔اس سلسلے سے کھنڈر، دوسرا نکاح اور رانی وغیرہ بہترین افسانے ہیں۔

آپ کے افسانے اپنے زمانے اپنے ماحول کے اردگرد کے تمام مسائل کو طشت از بام کرتے ہیں۔ کردار بھی جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔اس سلسلے سے احمد یوسف فرماتے ہیں:

''ان کی کہانیاں دکھ درد کی رفیق ہیں۔ظالم اور مظلوم کی جنگ میں مظلوم اور استحصال شدہ طبقے کا ساتھ دیتی ہیں۔ان میں بیرونی اقدار اور جنگ کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات کا ذکر بھی ملتا ہے عمل کا پہلو بھی ہے اور افطار رفتہ رسم ورواج پر ٹھوکریں لگانے کا رجحان بھی۔''

آہنگ گیا، احتشام حسین نمبر ۱۹۷۳ء

مختصر یہ کہ آپ کے افسانوں کے پلاٹ سادہ منظّم اور مربوط ہیں۔ان افسانوں میں تسلسل بیان بھی موجود ہوتا ہے جو افسانے کی خاص خوبی تسلیم کی گئی ہے۔تجسس بھی قائم رہتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اظہار کی بھرپور طاقت تصادم کشمکش مستقبل کا اشاریہ تجسس اور بصیرت کی روشنی ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔بیانیہ اسلوب بیان میں تحریر کردہ آپ کے افسانے اپنا خاص جلوہ رکھتے ہیں۔ان افسانوں میں غیر شعوری جذبہ کی کارفرمائی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔عشق ومحبت جیسے موضوعات کے گرد بھی آپ کے افسانے گردش کرتے نظر آتے ہیں۔اس سلسلے سے ہنگامہ ہستی

سے دور، مقناطیس، رجونتی، ایثار اور قطرے میں طوفان وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

آپ کے افسانوں میں عبارت آرائی اور شاعرانہ زبان پر خصوصی توجہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس سلسلے سے افسانہ ''قطرے میں طوفان'' کا یہ اقتباس دیکھئے:

> ''جہاں ہونٹ طلوع سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں جہاں ہوا کے سرد و نرم جھونکے اعضا میں ڈھل جاتے ہیں۔ جہاں عارضوں کی سرخی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے۔''

ویرانے، احتشام حیسن، ص-۵۱

تمام باتوں کی روشنی میں کہا جائے گا کہ احتشام حسین نے اپنے افسانوں میں حقیقت پسندی کو اس طرح برتا کہ خارجی دنیا کی تصویر کشی اور حقیقت پسندی کا فرق واضح ہو گیا۔ اس پر اضافہ یہ کہ آپ کو اسلوب پر قابو زبان پر قدرت اور بیان کی طاقت میسر تھی۔ آپ کے اندر ایک اچھے افسانہ نگار کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ تمام عناصر ترکیبی کے ساتھ ساتھ موضوع کا Treatment بھی آپ کے یہاں خوب ہے۔

☆☆☆

اردو افسانے کا اولین معمار: پنڈت بدری ناتھ سدرشن:
حیات و خدمات: ایک تحقیقی جائزہ

دنیش کمار ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ملخص

سدرشن اردو ادب کی دنیا میں ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور انہوں نے لگ

بھگ ہر صنف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے مثلا:افسانہ نگاری،ناول نگاری،ڈرامہ نگاری،ادب اطفال کے لئے کہانیاں ،فلموں کے لئے کہانیاں،فلموں کے لئے گیت،نظمیں ،اخبار کی ادارت،کتابوں کی اشاعت وغیرہ وغیرہ۔مگر ان کی زیادہ تر شہرت و مقبولیت کہانی نویس اورافسانہ نگار کی حیثیت سے ہوئی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ سدرشن افسانہ نگاری کی تاریخ میں اس کی بنیادگزاروں میں سے ایک تھےتو بیجا نہ ہوگا اس لئے کہ جس دور میں پریم چند کہانی کی دنیا میں چھائے ہوئے تھےاوران کی کہانیوں کا گھر گھر چرچا تھااسی دور میں سدرشن بھی اس میدان میں وارد ہوئے اورانہوں نے ایسی شہرت پائی کہ کہانی میں سدرشن اور پریم چند کا نام ایک ساتھ لیا جانے لگا۔مگر چونکہ سدرشن ادبی میدان چھوڑ کر فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے تھے اس لئے سدرشن اس مقابلے میں بہت پیچھے رہ گئے۔

☆☆☆☆☆

جداد کشمیری برہمن سے تعلق رکھتے تھے۔کسی وقت یہ لوگ کشمیر سے نقل مکانی کر کے سیالکوت میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ان کے والد گورودتامل شملہ میں واقع گورمنٹ پریس میں پروف ریڈر کی حیثیت سے سرکاری ملازم تھے،لیکن چونکہ انہوں نے اپنی رہائش کے لئے سیالکوٹ میں ذاتی مکان بنوالیا تھااس لیےان کا سارا پریوار شملہ کے بجائے سیالکوٹ ہی میں مقیم ہوگیا۔

گورودتامل اور جمنا دیوی کے کل.چار بیٹے اورایک بیٹی تھی بیٹوں کے نام:پنڈت جگن ناتھ شرما،پنڈت امرناتھ شرما،پنڈت وشمبھر ناتھ شرما اور پنڈت بدری ناتھ شرما تھےاور بیٹی کا نام پنڈت بدری ناتھ نے ابتدائی تعلیم سےلیکر میٹرک تک''اینگلو ورنیکولر اسکول'' سیالکوٹ سے حاصل کیا۔اس کے بعد کالج میں داخلہ لیا مگر کسی وجہ سے تعلیم کو بیچ ہی میں ترک کر دیا۔مگر طالب علمی کے زمانے سے ہی انہیں نصابی کتابوں سے زیادہ ان کی دلچسپی ادبی کتب و رسائل کی جانب تھی اسی لئے وہ اپنا زیادہ تر وقت نصابی کتابوں سے زیادہ قصے کہانیاں پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔مگراس کے باوجود پڑھائی میں بھی ہوشیار طلبا میں شمار ہوتے تھے ۔ وہ اسکول اور کالج کے زمانے میں باقاعدگی سے کلاس روم میں جاتے تھےاوراساتذہ کوان سے کبھی شکایت نہیں رہی تھی اوراپنی ذہانت وفطانت کی بدولت کلاس میں

جو کچھ بھی پڑھایا جاتا تھا، اسے ذہن نشین کر لیتے تھے اور اتنے اچھے نمبر لے کر امتیازی حیثیت سے امتحان پاس کرتے تھے کہ اساتذہ اور ان کے ہم جماعت حیران رہ جاتے تھے۔

انہیں دنوں لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''مارتنڈ'' میں ایک مضمون بعنوان '' کچھ کر کے دکھائیں'' لکھا۔ اس کے بعد پھر انہوں نے طبع زاد کہانیاں لکھنے کی طرف رجوع کیا۔۱۹۱۳ء میں سدرشن اردو کے اخبار ''ہندوستان'' کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے، لیکن ایک مہینے بعد ہی وہ اسے ترک کر کے جالندھر چلے گئے جہاں انہیں ''بھارت'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا، لیکن کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ اس سے بھی مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے۔ اس دوران وہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی کہانیاں لکھنے کی مشق کرتے اور سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں ''کمل کی بیٹی'' الہ آباد سے شائع ہونے والے رسالے ''سرسوتی'' میں شائع ہوئی۔ قیام لاہور کے دوران انہوں نے معروف رسالے ''ہزار داستان'' میں بھی لکھنا شروع کیا جس کی وجہ سے ان کی شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنا اخبار ''چندر'' بھی نکالا مگر ناخوش گوار حالات کی بنا پر اخبار کو بند کر دینا پڑا۔ اخبار ''چندر'' کے بند ہو جانے کے بعد کچھ مدت وہ فری لانسر صحافی اور کہانی نویس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے مالی مشکلات کے باوجود اپنے مکتبہ ''رام کٹیا بک ڈپو'' کی شروعات کر دی جس کے تحت ان کی بہت سی کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ اسی میں ان کا لکھا ہوا مشہور ڈرامہ ''دیانند'' بھی شامل ہے۔ اسی تک و دو میں ملازمت بھی کی۔ ۱۹۲۷ء کے اوائل میں اڑھائی سو روپئے ماہوار پر بطور پبلی سیٹی انچارج ان کا تقرر کانپور کی مشہور ''لال املی دولن ملز'' میں ہوئی، مگر چونکہ وہ گاندھی جی کی تحریک ''تحریک عدم تعاون'' کی حمایت و تائید کرتے تھے اس لئے جلد ہی اس منصب سے برطرف کر دئے گئے۔ البتہ کانپور آنے کے بعد ان کے لئے ایک راحت و مسرت کی بات یہ تھی کہ یہاں ان کی ملاقات ''زمانہ'' کانپور کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم اور مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند سے ہوئی جو بعد میں گہری دوستی میں بدل گئی۔

کانپور سے ملازمت ختم ہونے کے بعد سدرشن پھر لاہور چلے گئے جہاں ۱۹۳۱ء میں انہوں نے ایک ماہنامہ ''چندن'' کی اشاعت کی جسے ادبی حلقوں میں بڑی شہرت و پزیرائی ہوئی۔ مذکورہ رسالہ عام اردو رسائل سے اس معنی میں منفرد تھا کہ اس میں غزلیں اور نظمیں شائع نہیں کی جاتی تھیں بلکہ اس میں صرف اور صرف افسانے ہی شائع کئے جاتے تھے۔

اس کے بعد سدرشن کی زندگی میں ایک نیا موڑ نئی امید اور تازگی کے ساتھ آتا ہے۔ یعنی ۱۹۳۲ سے لیکر ۱۹۵۰ تک لگ بھگ تین عشروں پر مشتمل ایک لمبا عرصہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو کر اپنی زندگی کا ایک قیمتی عرصہ اسی میں بسر کر دیا۔ اس دوران انہوں نے فلموں کے لئے کئی کہانیاں بھی لکھے اور گیت بھی قلم بند کئے۔ ان کی فلمی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک کامیاب کہانی کار، گیت کار اور مکالمہ نویس تھے۔ ان کی فلمی دنیا میں انہیں گراں قدر خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ۱۹۵۰ میں ''فلم رائٹرز ایسوسی ایشن'' قائم ہوئی تو انہیں اس کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔

سدرشن کی ادبی خدمات: سدرشن ادب برائے زندگی کے قائل تھے بلکہ انہوں نے حقیقت پسند تخلیق کے لئے اپنا قلم کو وقف کر رکھا تھا۔ وہ حقیقت پسند اور انسانیت نواز ادیب تھے اور ان کی کہانیوں اور ناولوں کے کردار زندگی سے جڑے ہوتے تھے۔ انہوں نے اخلاقی اقدار کو استحکام بخشنے کے لیے کچھ ایسے تاریخی حوالوں کو منتخب کیا اور انہیں بنیاد بنا کر اپنی تاریخی کہانیوں کی تخلیق کی۔ ان کی اہم تاریخی کہانیاں وزیر عدالت، پرانی دہلی کا آخری چراغ، مہاراجہ رنجیت سنگھ وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ کہانیاں ملکی اور غیر ملکی ماحول اور واقعات کو. بنیاد بنا کر قلمبند کی گئی ہیں اور ان میں اخلاقی اقدار کی قدر و منزلت کو پیش کیا گیا ہے۔ عورت کی عزت و تعظیم بھی ان کی کہانیوں میں ایک اہم موضوع ہے۔

انہوں نے سماجی، تاریخی، اخلاقی اور سیاسی کہانیاں لکھیں۔ خصوصاً اپنے دور کی سیاسی اُتھل پتھل اور اہم واقعات کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے کئی کہانیا میں قلمبند کیں۔ آپ نے گاندھی جی اور ان کی سودیشی اور عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہو کر بھی کئی کہانیاں تخلیق کیں۔ جن میں بدیشی کپڑوں کو تیاگ کر، انہیں جلا کر کھدر کے کپڑوں کو اپنا لیا جاتا ہے۔ بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ کہیں ستیہ گرہ کی عکاسی کی گئی ہے اور کہیں مجاہدین آزادی کی قربانیوں کی۔ انہوں نے لوک مانیہ تلک کی وفات پر لکھی کہانی میں تیاگ اور قربانی کے جذبات و خیالات کی نہایت عمدہ تصویر کشی کی ہے جس میں ایک نوجوان مسلمان کے ان کی چتا میں کودنے سے متاثر ہو کر خطابوں کے پیچھے دیوانے محمد عباس بھی ملک و قوم کے لیے قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور قوم پرستی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔

انہوں نے مذہبی اور روحانی اقدار کی بنیاد پر بھی کئی کہانیاں لکھیں جیسے ''دو خدا'' اور ''گورو منتر'' وغیرہ۔ فن اور ادب کے مسائل پر بھی کئی کہانیوں کا تانا بانا بُنا۔ اس طرح کی کہانیوں میں ''شاعر'' خصوصی

طور پر قابل ذکر ہے۔طنز ومزاح سے بھر پور بھی کہانیاں لکھیں جیسے ''سائیکل کی سواری'' اور ''کیرے سکانیا'' وغیرہ۔اول الذکر کہانی سائیکل کی سواری ان کی ایک ایسی مزاحیہ اور دلچسپ کہانی ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری ان میں کھوسا جاتا ہے اور اپنی ہنسی کو روک نہیں پاتا۔پطرس کی کہانی 'مرحومہ کی یاد میں' کی طرح یہ کہانی بھی قاری کے دل ودماغ پر اپنے امٹ نشان چھوڑتی ہے اور اس میں ایسی مقناطیسی قوت ہے کہ قاری اسے ایک بار ہی نہیں بار بار پڑھتا اور محظوظ ہوتا ہے۔یہ کہانی واحد متکلم میں لکھنے کے باوجود اُن کی اپنی آپ بیتی نہیں بلکہ ایک تخیل کی اڑان ہے لیکن جس انداز سے انہوں نے اسے لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنی ہی آپ بیتی لکھ رہے ہوں۔

سدرشن نے ایک سو سے زائد کہانیاں لکھیں ہیں اور ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں ''آزمائش اور دیگر افسانے''،''لہارستان''،''پارس''،''چشم و چراغ''،''چندن''،''سدا بہار پھول''،''صبح ووطن''،''قوس قزح''،''طائر خیال'' وغیرہ شامل ہیں۔

سدرشن کی افسانہ نویسی پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر تہمینہ عباس فرماتی ہیں:

> ''سدرشن کو افسانہ نگاری کے فن کی نزاکتوں کا احساس ہو یا نہ ہو، مگر ان کے بعض افسانوں کے تمام اجزا میں فنی محاسن موجود ہیں۔''

ہمارے افسانے، سید وقار عظیم، ص-۱۰۲

بالخصوص افلاس کے زیر اثر جنم لینے والی سماجی برائیوں اور ناانصافیوں کو موضوع بناتے ہوئے سدرشن نے چھوت چھات، چھوٹی عمر کی شادی، ہندو بیواؤں کے مسائل اور دیہی علاقہ جات میں تہذیب ناشناسی پر ہمدردانہ نقطۂ نظر کے ساتھ قلم اٹھایا.....فکری سطح پر مہاشہ سدرشن کی پہچان مہاتما گاندھی کے افکار کا پرچار اور تکنیکی سطح پر مخصوص نوع کی اصلاح پسندی ہے، جس کی مثال سدرشن سے پہلے محض پریم چند کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔

سدرشن کے افسانوں کا خصوصی موضوع شہر کا ہندو سفید پوش ہے اور اس کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ (مثال: اپنی طرف دیکھ کر.....صدائے جگر خراش.....اور خانہ داری سبق) دیہات کی سیاسی بیداری دوسرا موضوع ہے جو سراسر پریم چند کے تتبع میں آیا ہے۔مہاشہ سدرشن کا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر متصوفانہ ہے۔ان کے کردار زندگی کے تلخ تجربہ کر کے لوبھ لالچ سے دُور ہٹتے جاتے ہیں۔حتیٰ کہ

قناعت پسندی کی حدوں میں گم ہوجاتے ہیں ۔ اس کی مثالیں افسانوی مجموعے چندن ، بہارستان، طائر خیال اور سدا بہار پھول میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔

سدرشن کی سماجی زندگی پر ان کی بیسیوں کہانیاں مبنی ہیں۔انہوں نے جو کہانیوں میں لکھا انہیں عملی زندگی میں اختیار بھی کیا۔وہ آزادی نسواں اور عورتوں کے تعلیم کے حق میں تھے۔سماجی برائیوں اور کٹرتا کی کھل کر مخالفت کی ہے۔سدرشن جی نے اس موضوع پر کئی دل پزیر کہانیاں لکھیں۔

آپ کے افسانوی موضوعات کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی فرماتے ہیں:

''سدرشن کے موضوعات بہت متنوع ہیں اور ان کی تخیل کی پرواز بھی کسی کم درجے کی نہیں۔ وہ زندگی کی پنہائیوں میں کبھی کبھی اتنا اونچا اڑتے ہیں کہ ان کا نظروں سے دور پہنچ جانا ہی اچھا معلوم ہونے لگتا ہے۔''

تنقیدی زاویے، ڈاکٹر عبادت بریلوی،ص-۳۱۶

سدرشن نے اپنے افسانوں کا سر چشمہ ایک جگہ نہیں رکھا۔ وہ کبھی دیہات کی زندگی اور واقعات بیان کرتے ہیں تو کبھی شہر والوں کے حالات کا نقشہ کھینچتے ہیں۔عموماً غریبوں اور دولت مندوں کی زندگی کا موازنہ ان کے افسانوں کا ماحصل ہوتا ہے جہاں وہ دکھاتے ہیں کہ امیروں کو باوجود دولت کے قناعت اور سکون نہیں ہوتا اور غریبوں کو افلاس کی حالت میں بھی طمانیت اور محبت کی لازوال دولت حاصل ہے۔سدرشن کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی کردار نگاری ہے۔ان کے افسانوں کے کردار ہماری زندگی کے افراد سے بالکل مطابق ہیں۔خصوصاً اوسط درجہ کی سوسائٹی کے لوگوں کے کرداروں کو وہ بیحد فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ سدرشن ذات پات اور رنگ ونسل کی بنیاد پر درجہ بندی کے بھی مخالف تھے۔ان کا کہنا تھا کہ جو مذہب انسانوں کو خانوں میں تقسیم کرتا ہے وہ جھوٹا مذہب ہے۔وہ انسانیت کو ہی سب سے بڑا دھرم مانتے تھے۔ پریم چند عہد کے ادیبوں میں سدرشن ایک اعلیٰ اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔صوبہ پنجاب ان کی زندگی میں ہی انہیں اعزاز سے نواز چکی تھی۔وفات سے پہلے وہ مختلف امراض کے شکار ہوگئے تھے۔آخر کار ۱۶ دسمبر ۱۹۶۷ء کو ممبئی کے ''ہرکشن داس ہسپتال'' میں وفات پا گئے۔اور اردو ادب ایک منفرد ادیب وافسانہ نگار سے محروم ہوگیا۔

☆☆☆

ہاڑوتی کا حالیٔ ثانی.....شبھو دیال دانشؔ

از۔روشن آرا۔

(ریسرچ اسکالر۔شعبۂ اردو۔موہن لال سکھاڑیہ یونیورسٹی،اودے پور۔(راج)

ملخص

میرا خیال یہ ہے کہ اس ہاڑوتی کے علاقے میں اردو شعر و ادب پر ابھی تک زیادہ توجہ

نہیں دی گئی ہے۔اس سلسلے میں پورے راجستھان میں صرف مفتوںؔ کوٹوی صاحب (وفات۔۱۹۸۰ء) کا ہی نام سامنے آتا ہے جنھوں نے تینوں ریاستوں میں اردوشعروادب کا بہت قریب سے جائزہ لیا ہے۔انھوں نے اپنی ذاتی تگ ودو سے بہت سے تحقیقی مضامین تحریر کئے جو ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔میں نے بڑی جستجو سے ان مضامین کو تلاش کیا ہے جن سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

بیسویں صدی میں ہاڑوتی علاقہ کے شعروادب پر اور اردو زبان کی ترویج وترقی میں جن شعراء اور ادباء نے اپنی خدمات انجام دی ہیں انھیں کسی طور پر بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ایسے لوگوں میں آغا شاعر قزلباش، نیرنگ کاکوروی، شنبھو دیال دانش، کیف ٹونکی، ثابت لکھنوی، پربھودیال رقم، اور مفتوں کوٹوی جیسے اہل علم کے نام سرفہرست ہیں۔ان کی خدمات اور ادبی کارنامے دیکھ کر یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اگر یہ لوگ اردوشعروادب پر اور اس کی ترویج کے سلسلے میں کوششیں نہیں کرتے تو اس علاقے میں اردو کبھی کی ختم ہوگئی ہوتی۔اس لئے ان کی خدمات کا سامنے آنا ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

راجستھان ابتدا سے ہی ایک اہم اور تاریخی صوبہ رہا ہے۔جسے پہلے راجپوتانہ بھی کہا جاتا تھا۔اور اس کے علاقے مختلف ناموں سے آج بھی مشہور ہیں۔جیسے میواڑ، مارواڑ، دھونڈارا اور ہاڑوتی۔یہ بھی ایک سچائی ہے کہ یہاں کے راجپوت تلوار کے دھنی تھے صاحب قلم نہیں تھے۔لیکن علم وادب کے بڑے قدردان تھے۔یہاں کے حکمرانوں نے ہمیشہ ہی ارباب علم وادب کی پذیرائی کی ہے۔مغلوں کے دور میں یہاں تعلیم اور زبان وادب پر توجہ کی جانے لگی۔کیوں کہ شہنشاہوں کے جو فرامین یا سیاسی خطوط آتے تھے وہ فارسی زبان میں ہوا کرتے تھے۔لہٰذا فارسی زبان وادب پر توجہ دی جانے لگی تھی۔

ہاڑوتی راجستھان کا ایک مردم خیز اور زرخیز علاقہ ماضی میں تھا اور آج بھی ہے۔چودھویں صدی تک بھیل قوم کے کئی قبیلے یہاں آباد تھے جنھیں ہاڑا راجپوتوں نے مار بھگایا۔اور شہر بوندی کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔اس وقت سے یہ علاقہ ہاڑا راجپوتاوں کی مناسبت سے ہاڑوتی کہلانے لگا۔اس علاقے میں ان کا کافی اثر ورسوخ تھا۔ہاڑا راجپوت: چوہان راجپوت کے خاندان کی ایک اہم شاخ ہے۔یہ کم و

بیش پانسو سال تک اس علاقے کے مختلف حصوں پر قابض رہے۔

ریاست بوندی کی بنیاد ۱۳۴۲ء میں رکھی گئی۔اس کے حکمران راجپوتوں کے ہاڈا نسل سے تھے۔اسی لئے یہ علاقہ ہاڑوتی کہلاتا ہے۔یہاں کے حکمران مغل بادشاہوں کے درباری تھے جہاں سے ان کو اعزازات ملتے تھے۔بوندی کا راجہ راؤ رتن سنگھ (۱۶۱۸ء۔۱۶۸۸ء) جہان گیر کے دربار میں پنج ہزاری منصب پر فائز تھا۔اس نے سربلند رائے اور رام راج کے خطابات پائے تھے۔

علاقائی اعتبار سے اس علاقے کی عوامی زبان کا بھی ایک خاص رنگ ومقام ہے۔یہاں بولی جانے والی زبان کو ہاڑوتی زبان ہی کہا جاتا ہے۔جو میواڑی، مارواڑی اور ڈھونڈاری سے قدرے مختلف ہے۔ اٹھارویں صدی میں ہاڑا خاندان کے ہی کچھ لوگوں نے بوندی سے علیحدہ ہوکر کوٹہ ریاست کی بنیاد رکھی۔ انگریزوں کے دور میں ریاست کوٹہ سے الگ ہوکر جھالا راجپوتوں نے جھالاواڑ کے نام سے ایک نئی ریاست قائم کرلی۔اس طرح بوندی، کوٹہ اور جھالاواڑ، تینوں ریاستوں کو ملاکر ان کے علاقے کو ہاڑوتی کہا جاتا ہے۔

تینوں ریاستوں میں بوندی واحد ایسی ریاست ہے جس میں کبھی اردو سرکاری زبان نہ بن سکی۔اس کے برعکس کوٹہ اور جھالاواڑ میں بڑے عرصہ تک اردو سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔بوندی کے حکمراں صرف ہاڑوتی زبان میں ہی سرکاری کام کاج پسند کرتے تھے۔اگر ہم بوندی کو نظر انداز کر بھی دیں تو کوٹہ اور جھالاواڑ میں اردو شعروادب نے بے پناہ عروج حاصل کیا۔ریاست کے حکمراں بھی اس کی ترقی کا سبب بنے۔۱۹۱۱ء تک دونوں ریاستوں میں اردو کا زبردست چلن رہا۔

ریاستی دور میں جھالاواڑ میں اردو نثر اور نظم کو بہت عروج حاصل ہوا تھا۔ان ایام میں شعراء بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔اس سلسلے میں ایک کتاب کا نام سامنے آتا ہے، وہ ہے ''ہاڑوتی کا دبستان شاعری'' جس کو ۲۰۱۹ء میں جے پور سے شائع کیا گیا ہے۔جس میں ہاڑوتی کے جھالاواڑ کے شعری ادب پر گفتگو کی گئی ہے۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جھالاواڑ کی شاعری کے ذکر کے بغیر راجستھان کے شعری ادب کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

دنیا کی ہر زبان کے ادب میں ہمیشہ ایک مقصد پوشیدہ ہوا کرتا ہے۔اور وہ مقصد فنکار کو نہ صرف اپنی منزل کی جانب گامزن کرتا ہے بلکہ اپنے پیچھے ادب کا ایک کارواں بھی بنالیتا ہے۔جو آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ریاست جھالاواڑ میں بیسویں صدی کے اوائل میں ایسی ہی شاعری

سامنے آتی ہے، جس میں سرسید اور حالی کے اصلاحی پیغامات مضمر ہیں۔ شنبھو دیال دانش دہلوی جو ریاست جھاواڑ میں ناظرِ عدالت اور سول جج تھے اور جنھیں وہاں کے دربار میں بڑا منصب بھی حاصل تھا، ان کی ''کلیات دانش'' (مطبوعہ ۱۹۲۶ء) کا اگر مطالعہ کریں تو ایسی ہی با مقصد شاعری ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کی مشہور نظمیں میں ''قومی نظم'' بہت مشہور ہے۔ ان کی دیگر مشہور نظموں میں، پرانی شاعری، شانِ ایمان، شاعر کی دعا، دغا باز دوست، آدمی کی پہچان، رکابیٔ مذہب، خوشامد پسند حاکم، اہل ہند سے اپیل، تعلیم کا کرشمہ، بے حیا، مشہور و معروف نظمیں ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ کے بعد اگر انھیں راجستھان کا حالیؔ ثانی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ دانشؔ سرسید اور حالی کے تحریکات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان سے متاثر بھی ہوئے تھے۔

جھالا واڑ کے راجہ بھوانی سنگھ (۱۸۸۶ء۔۱۹۲۹ء) کے دور میں شمبھو دیال دہلی سے جھالا واڑ آئے تھے۔ ان کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ ''کلیات دانش'' کی ابتدا میں دانشؔ خود لکھتے ہیں:

> ''مجھے اپنی اس ناچیز تصنیف کی اعلیٰ کامیابی پر جس قدر ناز و افتخار ہو بجا ہے کیوں کہ میرے آقائے نامدار، میرے ولی نعمت، میرے سرپرست حضور پر نور عالی جناب معلیٰ القاب شری حضور مہاراج رانا بھوانی سنگھ جی صاحب بہادر دام اقبالہم فرمانروائے ریاست جھالا واڑ نے اس کلیات کے چھپوانے اور تصنیف کرانے میں میرے ساتھ جو کچھ احسانات فرمائے ہیں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میں خاطر خواہ الفاظ فراہم نہ کرسکتا تھا کہ دوسری نوازش خسروانہ یہ فرمائی کہ میری درخواست پر بحکم ۱۴/ اکتوبر، ۱۹۲۶ء اس مجموعہ کو اپنے مبارک نام نامی پر ''سمرپن'' کرنے کی اجازت عطا فرما کر اس کتاب کے ناظرین کی نگاہوں میں اپنے اس نمک خوار کی بے انتہا شان بڑھادی۔۔ کمترین.... شمبھو دیال دانشؔ سول جج۔ ریاست جھالا واڑ''۔

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مہاراجہ بھوانی سنگھ کے عہد میں نہ صرف جھالا واڑ میں موجود تھے بلکہ سول جج بھی تھے اور مہاراجہ کے نورِ نظر بھی تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جھالا واڑ میں ادبی مرکزیت رکھتے تھے۔

دانش کی ابتدائی شاعری میں ہندوستان کا روایتی انداز پایا جاتا ہے۔لیکن بعد میں ملک کے حالات کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے دانش نے اپنی شاعری کا رنگ بدل ڈالا۔انھوں نے قومی یکجہتی کی اہمیت،تعلیم کی ضرورت،سماجی غیر ضروری رسم و رواج،جیسے اہم مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔عبد الوحید نیر نگ نے کلیات دانش کا دیباچہ لکھا ہے،اس میں دانش کی شخصیت اور شاعری پر توصیفانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اسی کلیات میں مہاراجہ کی تقریر بھی شامل ہے جو دانش کی توصیف میں سر دربار مہاراجہ نے فرمائی تھی۔اور اپنی سالگرہ کے موقع پر دانش کو ملک الشعراء کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

کبھی ایسی کرتے تھے ہم شاعری کہ خود بے حیائی بھی شرماتی تھی
رقیب اپنے فرضی بناتے تھے ہم شرافت کو بٹہ لگاتے تھے ہم
کبھی وہ مضامین موزوں کئے کہ شیطان کو بھی نہیں سوجھتے
سراپا کسی کا اگر لکھ دیا تو بے غیرتی نے بھی منھ ڈھک لیا

(پرانی شاعری۔کلیات دانش،جیل پریس،جھالاواڑ،۱۹۲۶ء۔ص۔۵۔۶)

سماجی برائیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دانش فرماتے ہیں:

ایک دن یمراج نے پرماتما سے عرض کی تیری ساری منصفی گنگا بہا کر لے گئی
بے تکلف بخش دیتی ہے وہ بندوں کی خطا ہو گیا کایا پلٹ ،اشنان جس نے کر لیا
اس کی رحمت پر میں صدقہ اس کی شفقت پہ نثار ایک غوطے میں لگاتی ہے گنہہ گاروں کو پار
تو تو کہتا تھا کہ انساں کرم کا پھل پائیگا کوئی پاپی آدمی ہرگز نہ بخشا جائے گا
وید تیرے طاق میں گنگا نے لیکن دھر دئے بڑھ گئے مولا گنہہ گاروں کے بے حد حوصلے

(نجات کی امید پر گنگا اشنان۔،کلیات دانش۔۱۹۲۶ء)

دانش کی ''قومی نظم'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں،ان سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے فکرو نظریات کیا تھے۔یہ ایک طویل نظم ہے،اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نظم کو عوام کی فرمائش پر علیحدہ سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔۔اس نظم میں وہ ہندوستانیوں سے براہِ راست مخاطب ہیں،اور خطاب کے انداز میں فرماتے ہیں،

کبھی آپ لوگوں نے دل میں یہ سوچا کہ دنیا میں کیا مرتبہ تھا ہمارا
کبھی آپ نے اپنا شجرہ بھی دیکھا کہ ہم کس گھرانے کے تھے نام لیوا
ہمارے بزرگوں کے کیسے چلن تھے وہ کتنے طرفدارِ اہلِ وطن تھے
تم اُس کان کے جوہرِ خوش نما تھے تم اس بحر کے گو ہرِ بے بہا تھے
تم اس باغ کی جانفزا رنگ و بو تھے تم اس ملک کی زینت و آبرو تھے
تم اُس دیش کی آب و گل سے بنے تھے کہ رام ولکھن جس سے پیدا ہوئے تھے

ان اشعار کے بعد ہندوستانیوں کے شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

وہی قوم بھارت کی روحِ رواں تھی وہ پشت و پناہِ بے کساں تھی
وہ حاجت روائے دلِ مفلساں تھی حقیقت تو یہ ہے وہ جانِ جہاں تھی
وہ مصدر تھی مخزن تھی علم و ہنر کی لیاقت رگ و پے میں اس کے بھری تھی
کروڑوں بشر تھے مگر ایک دل تھے اگر فرق تھے ان میں تو قالبوں کے
اسی کا زمانے میں بجتا تھا ڈنکا اسی کا رہا کرتا تھا بول بالا

ہندوستانی قوم کی موجودہ حال پر افسوس کرتے ہئے دانش لکھتے ہیں،

مگر اس کی تم نے یہ حالت بنائی زمانے میں توقیر اتنی گھٹائی
مٹاتے مٹاتے یہاں تک مٹائی قیامت سے پہلے کردی صفائی
پڑے بھاڑ میں جا کر ایسی جہالت گڑے جا کے پاتال میں یہ حماقت
رذیلوں سے بدتر ہے آج اس کی ہستی شرافت کے ڈھانچے میں جو ڈھل رہی تھی

دانش کے یہ فکر ونظریات، صرف نظم تک ہی محدود نہیں تھے، بلکہ وہ اپنی غزلوں میں بھی پاکیزہ مضامین قلم بند کرتے تھے۔ ذیل میں غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہر گز وہ اعتبار کے قابل نہیں بشر جس کو خدا کا خوف قیامت کا ڈر نہ ہو
جانور کا نام تھا عنقا کبھی اب جہاں میں آدمی کا ہو گیا
دنیا میں کوئی شے نہیں نایاب، یہ غلط بتلایئے پتہ تو کسی غم گسار کا
مد نظر تھی یار کی دانش رضا مجھے کہنا پڑا ہر اک سخن پر بجا مجھے

بد گمانی ہو تو میرے دل میں ✿ آپ کو کیوں وہم پیدا ہو گیا

(ہاڑوتی کا دبستان شاعری۔ڈاکٹر شاہد جمالی۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی،جیپور۔۲۰۱۹ء۔ص۔۸۸)

دانشؔ ایک خوش نصیب انسان تھے جنھیں مہاراجہ کی سر پرستی کے علاوہ نیرنگ کا کوروی، عالم گیر کیفؔ ٹونکی اور آغا شاعر قزاباش جیسے مشہور و معروف شعراء کا ساتھ ملا۔جھالا واڑ کے سرکاری رسالے''آفتاب'' کا ۱۹۲۰ء میں احیا کیا گیا تھا،جس کے ایڈیٹر آغا شاعر قزالاش بنائے گئے تھے۔یہ رسالہ ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔ان سات سالوں میں مذکورہ حضرات کی بیشتر تخلیقات اس رسالے میں شائع ہوتی رہی ہیں۔آخر میں والئ ریاست مہاراجہ راجندر سنگھ مخمورؔ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہوں،جنھوں نے اس علاقے میں اردو زبان و ادب کی ترویج وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ریاست میں ہندی کو سرکاری زبان بنائے جانے کے باوجود اردو کی سر پرستی کرتے رہے۔

مہاراجہ راجندر سنگھ۔مخمورؔ

والی ریاست جھالا واڑ،(۱۹۲۹ء۔۱۹۴۲ء) خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔مخمورؔ تخلص کرتے تھے۔حالانکہ ان کا دیوان بھی مرتب ہو چکا تھا لیکن زیورطبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔مخمو شاعری میں اصلاحی پہلی اوراخلاقی مضامین پسند فرماتے تھے۔اپنے دور کے کئی حالات اور واقعات کا انھوں نے اپنی شاعری میں ذکر کیا ہے ۔مفتوں کوٹوی نے مخمورؔ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔مندرجہ ذیل سطور ان کے حوالے سے لکھی جارہی ہیں۔

> ''مہاراجہ نے اردو کی خدمت کا جذبہ ورثہ میں پایا تھا۔ان کے والد مہاراجہ بھوانی سنگھ(۱۸۹۹۔۱۹۲۹) نے بھی اردو کی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔''۔''جب مسندآرائے ریاست ہوئے تو انھوں نے بھی ریاست میں ذوف شعروسخن کو تازہ رکھا۔راجندر سنگھ خود شاعر تھے۔اردو میں مخمور اور ہندی میں سدھاکر تخلص کرتے تھے۔انھوں نے مویوی نیرنگ کو اپنا استادسخن بنایا تھا۔''

نمونہ کلام:

مقدر جاگتا تھا خواب غفلت میں نگہباں تھا
مبارک رات تھی جس شب کو عزم کوئے جاناں تھا

تصور سے رخ روشن کے دل اپنا درخشاں تھا
ہمیشہ چودھویں کا چاند میرے گھر میں مہماں تھا
درد دل بیتاب سے واقف ہو کہاں تم
جو مجھ پہ گزرتی ہے وہ پوچھو مرے جی سے
حسن کی رنگینیوں پر جس کا دل مائل نہیں
وہ حقیقت میں مرے نزدیک اہل دل نہیں
نکاے ادھر جو طائرِ جورو جفا کے پر
پیدا ہوئے ادھر مری آہِ رسا کے پر
دیکھا جو گلستاں میں درودِ خزاں کا رنگ
بلبل نے خود گرادئے سب پھڑ پڑا کے پر
یارب مجھے کچھ زعم نہیں جاہ و حشم کا
محتاج ہوں ہر وقت ترے لطف و کرم کا

(مفتوں کوٹوی کا مضمون۔راجندر سنگھ مخمور کی اردو شاعری''۔شان ہند۔دسمبر۔۱۹۷۲ء۔ص۔۲۷)

☆☆☆

ہندو مذہب کی تعلیمات: اجمالی جائزہ

ڈاکٹر گلزیدہ خان

ملخص

مذہب اور معاشرت اور دین و دنیا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔نوع

انسان کی بھلائی ارفلاح و بہبودی کے لئے ابتدائے آفرینش سے اب تک جتنی بھی قوتوں نے کام کیا ہے۔''مذہب'' ان ساری طاقتوں میں زبردست حیثیت کا حامل ہے۔زندگی کے عام شعبوں میں اسی کی کارفرمائی ہےاور دنیا کے تمام نظام ہائے قومی کے پس پشت یہی قوت پوشیدہ نظر آتی ہے۔یہ مذہب ہی ہے جوانسانوں کوہم خیال بتایا ہے۔ یہ مذہب ہی ہے جوافرادانسانی کومتفق اورمتحد کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔اوران میں ساتھ مل کر کچھ کرنے کا جوش وجذبہ ابھارتا ہے۔یہ بات مسلمہ ہےاور دانشوروں حکمیوں نے بھی اسے تسلیم کیا ہے کہ بسا اوقات مذہبی تعلقات خاندانی وملکی تعلقات سے زیادہ مضبوط ثابت ہوتے ہیں۔اور یہ بات بھی سورج کی طرح عیاں ہے کہ جوآدمی اورافراد کسی ایک ہی مذہب کو مانتے ہیں کسی ایک ہی عقیدے پر قائم رہتے ہیں اورایک ہی خدا کی پرستش وعبادت کرتے ہیں وہ ایک''قوم'' کی بہ نسبت زیادہ استقلال اوراتفاق کے ساتھ باہم مل کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔کچھ لوگ اپنی پراگندہ ذہنیت کے سبب دہریے اور ناستک ہو سکتے ہیں۔لیکن مذہب انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور بغیر مذہبی اعتقاد کے وہ زندگی کے وسیع وعریض میدان کو بہ آسانی عبورنہیں کرسکتا مذہب انسان کی روحانی غذا ہے جواسے سکون واطمینان اور یک گونہ مسرت وانبساط بخشتی ہے۔اوراگر دوربینی سے دیکھا جائے تواسی سے طبع انسانی کی کل چلتی ہے۔اس کے بغیر چارہ نہیں۔

☆☆☆☆☆

مذہب کی ابتدا :

مذہب کا آغاز کسے ہوا؟ اور دنیا میں مختلف مذاہب کس طرح پھیلے؟ حتمی طور پراس کی ابتدا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔مختلف خیالات واعتقادات اور مسائل ومعاملات جب سے دنیا قائم ہوئی ہے تب سے ہی انسانی زندگی میں مروج ہیں۔زمانہ قدیم سے جو مذاہب چلے آتے ہیں۔ان میں یہ دعویٰ پایا جاتا ہے کہ وہ ماروائے قدرت ہیں یعنی کہ وہ انسانی دماغ سے نہیں نکلے ہیں بلکہ ان کی ابتدا کہیں باہر سے ہوئی ہے۔جدید محققوں اور مورخوں کے ایک گروہ کا خیال ہے

کہ مذہب کی پیدائش کے خیال کا آغاز'' پرستش بزرگاں'' سے ہوا ہے۔انسان کا قاعدہ ہے کہ وہ فوت شدہ رشتہ داروں اور قریبی عزیزوں کی یاد تازہ و برقرار رکھنا چاہتا ہے اور انہیں اپنے قریب سمجھتا ہے۔کیونکہ موت پر انسان کا کوئی قابو نہیں ہے لہذا یہی خیال ترقی پا کر مذہب بن گیا ہے۔ اگر ہم مصر کی تہذیب کا جائزہ لیں یا بابل کی تہذیب پر نظر کریں ورنہ قدیم چینی سویلیزیشن کے اندرون میں جائیں تو یہی'' پرستش بزرگاں'' مذہب کی بنیاد سے وابستہ نظر آئی گی۔قدیم مصریوں میں مذہب کا خیال'' ہمزاد سے وابستہ تھا۔ایسا مانا جاتا ہے کہ انسان کے پیکر خاکی میں اسی شکل کا ویسا ہی انسان لطیف رہتا ہے اور جب آدمی اپنی عمر طبعی پار کر کے مرجاتا ہے تو یہ ہمزاد جسم سے باہر نکل جاتا ہے۔مگر زندہ و باقی رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ قدیم مصری بقائے لاش کی سعی کرتے تھے۔ان کی ممیاں بناتے تھے اور ان کے لئے مخروطی مینار تعمیر کرتے تھے۔مصر کے پیرامڈ تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ چینی و بابل بھی اس اعتقاد سے مستثنی نہیں ہیں۔قدیم ہندوؤں میں بھی پرستش بزرگاں کا سراغ ملتا ہے۔

دوسری طرف اس خیال کے برعکس وہ محقق حضرات ہیں جو قدیم آریائی پستکوں کے حوالے دے کر یہ کہتے ہیں کہ اگر چہ ہندوستان کی دھرتی پر چپہ چپہ پر پرستش بزرگاں ملتی ہے لیکن ہندوؤں کی سب سے بڑی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ان کے نزدیک'' رگ وید'' میں قدرتی مظاہر کی پرستش کا خیال ملتا ہے یونانی دیوی دیوتاؤں میں بھی قدرتی طاقتوں کی پرستش کی جھلکیاں ملتی ہیں۔مذہب کی ابتداء گویا قدرت کی عظمت بتانے والی طاقتوں سے ہوئی ہے۔ان دیکھی قوتوں کے خوف سے بھی انسانی ذہن متاثر ہوا اور اس نے بھی مذہبی رجحان کو پیدا کرنے میں زبردست رول ادا کیا۔

مذہبت کی ماہیت :

دنیا میں فی الوقت مختلف مذاہب رائج ہیں اور ہر ایک مذہب کے اپنے اصول وضوابط اور قاعدے قانون ہیں مگر مذہب تحریک عملی کا نام ہے۔انسان کو دراصل اپنے مذہب سے ہی کچھ کرنے کی ترغیب وتحریک ملتی ہے۔مذہب کی طرف مائل ہونے والے اور اس کی طرف رجوع کرنے والے آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک تو غور وفکر کرنے والا دانش

مند طبقہ اور دوسرا معمولی کاروباری آدمیوں پر مشتمل طبقہ جو غور وفکر کی بجائے عمل کا شیدائی ہے فلسفی اپنے استدراک کی بدولت یقین کے درجے تک پہنچتا ہے اور یوں اس کا اعتقاد مضبوط اور راسخ ہوتا ہے۔ عام کاروباری آدمی کو عقل واستدراک اور دلیل و برہان درکار نہیں بلکہ وہ اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے صرف شرڈھا یا اعتقاد کا بندۂ بے دام ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مذہب کے ساتھ عقیدہ جڑا ہوا ہے اور دونوں لازم وملزوم چیزیں ہیں۔ مذہب کوئی بھی ہو اور کسی بھی نوعیت کا ہو اس میں اعتقاد ہی انسان کے دل ودماغ کو قوت بخشتا ہے اور اسے برائی کے راستوں پر گامزن ہونے سے روکتا ہے۔

علاوہ ازیں مذہب دو صورتوں میں اثر پذیر ہوتا ہے:

(i) روحانیات (ii) بیرونیات

مذہب کے رموز اور اس کا عرفان بذریعہ روحانیات ان لوگوں کے واسطے ہے جو عقل وادراک اور فہم وذکا رکھتے ہیں۔ اور اس کوشش میں رہتے ہیں کہ حقیقت تک پہنچ جائیں۔ ''بیرونیات'' ان لوگوں کے واسطے ہے جو کاروباری اور عملی آدمی نہیں اور اپنے کرم (کام) کے ذریعے معرفت کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

ہندومت کی قدامت :

ہمارے ملک ہندوستان میں اگرچہ مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ رہتے ہیں لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اپنے کو ''ہندو'' کہتے ہیں۔ اور ہندومت کے پیرو کار ہیں۔ ہندومت یا سناتن دھرم قدامت کے اعتبار سے ہیں بہت دور تک لے جاتا ہے۔ ''رگ وید'' ان کی سب سے پرانی مذہبی کتاب ہے۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۰۰ اور ۱۵۰۰ (ق،م) کے درمیان تحریر کی گئی اور یہ بات بھی تسلیم کی جاتی ہے کہ ویدوں کو ضابطہ تحریر میں لانے سے قبل سیکڑوں سالوں تک ان کے منتر سینہ بہ سینہ حفظ کے ذریعے منتقل کئے جاتے تھے۔ اس لئے ہندو مذہب کی قدامت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ البتہ اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جب ایگمین (ا۔ یونانی افسانوں کے قدیم ترین نام جن کا وجود زمانۂ قدیم سے مدتوں قبل بتایا جاتا ہے) شاہ پریم کی ماہ پیکر لڑکی کی قصتورا سے اپنی شادی رچا رہا تھا اس وقت بھی ہندو برہمن

سورج (۲۔سورج برہمنوں کا قبلہ ہے۔ پرستش کے وقت ان کا منہ ہمیشہ اسی کی جانب رہتا ہے) دیوتا کی جانب منہ کئے گنگا ندی کے ساحل پر یہ منتر پڑھتا نظر آتا ہے:

''جے سورج دیوتا اور اے ہماری خواہشات کی روشنی ہم تیرے خیال میں مستغرق ہیں'' (رگ وید)

ہندو مذہب کی تعلیمات :

(۱) دھرم (مذہب) کے اگر ہندی ڈکشنری میں معنی دیکھے جائیں تو 'دھارن کرنے کے' ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انسان جو کرم (کام) کرتا ہے وہی اس کا دھرم ہے۔ کرم، یوگ، بھکتی اور گیان کی منزلیں طے کر کے ہی وہ نجات پا سکتا ہے۔ ہندو مذہب ایک طرح سے 'کرم پردھان' ہے اسی لئے چار ورن اور چار آشرم ترتیب دیئے گئے ہیں۔اس کے مطابق اگر ہندو مذہب کے پیروکاروں کو دیکھا جائے تو چار بڑی جماعتوں میں منقسم نظر آئیں گے۔یہی چار جماعتیں اور چار فرقے ہر ایک ملک میں اور ہر زمانے میں مصروف کار رہی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔کیونکہ انسانی برادری کی قدرتی تقسیم بھی یہی ہے اور اسی کے ذریعے کسی بھی ملک کا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ ہندو مذہب میں انہیں چار ورن' کا نام دیکر ان کے فرائض بھی مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

۱۔ برھمن : وہ جماعت اعلیٰ ہے جس کا کام تعلیم وتعلم، گیان دھیان اور پوجا پاٹھ ہے

۲۔ کشتری : وہ جماعت ہے جو ملک و مال کا انتظام سنبھالتی ہے۔زبردستوں سے زیردستوں کی حفاظت کرتی ہے۔امن وامان قائم رکھتی ہے اور موقع پڑنے پر دشمنوں سے جنگ وجدال کرتی ہے۔

۳۔ ویشے : وہ جماعت ہے جو کھیتی باڑی، صنعت وحرفت اور بیوپار و بزنس کر کے اپنی روزی روٹی کماتی ہے۔

٤۔ شُدر : وہ جماعت ہے جو مندرجہ بالا تینوں جماعتوں کی خدمت گذاری کرتی ہے۔اسی ضمن میں بتایا گیا ہے کہ اگر برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا پانی بھرتا ہے یا روٹی پکاتا

ہے تو وہ برہمن نہیں ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے یا وڈیا کو بیچتا پھرتا ہے تو وہ بھی برہمن نہیں ہے۔ جو اوصاف وفرائض جس ''ورن'' کو مقرر کر دیئے گئے ہیں اسی پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ ورنوں کی تقسیم گن اور کرموں کے لحاظ سے ہے۔ نہ کہ جنم و پیدائش کے لحاظ سے۔ گیتا کے ایک شلوک کا ترجمہ ایک شاعر نے اردو زبان میں اس طرح کیا ہے:

اوصاف جدا رکھ کے اور اعمال جدا
چاروں ذاتوں کو میں نے پیدا ہے کیا

تبدیلی ہے نہ مجھ میں خالق ہونا
خالق میں ہوں پھر بھی تو ان سب کا

(۲) چار آشرم بھی مسلمہ طور پر قدیم الایام سے چلے آتے ہیں۔ ان کے مطابق چوبیس سال کی عمر تک آدمی اپنے گرو (استاد) کی سیوا میں رہ کر وِدیا (علم) حاصل کرتا تھا۔ یہ ''برہم چریہ آشرم'' کہلاتا ہے۔ ۲۵ سال کی عمر میں وہ کسی بستی یا شہر میں رہ کر خانگی زندگی (گرہست جیون) اختیار کرتا تھا۔ شادی کر کے اولاد پیدا کرتا تھا۔ روزی روٹی کما کر اپنے کنبہ کی پرورش کرتا تھا۔ یہ ''گرہست آشرم'' ہے۔ پچاس سال کی عمر کے بعد وہ ''وان پرست آشرم'' میں داخل ہو جاتا تھا۔ یعنی پوجا پاٹھ دھیان گیان ہوگ وغیرہ میں وقت لگا کر دنیاوی تعلقات اور ذمہ داریوں سے دور ہو جاتا تھا۔ پچھتر سال گزر جانے پر وہ ''سنیاس آشرم'' اختیار کر کے جنگلوں میں نکل جاتا تھا اور کرموں کی قید سے گویا رہائی پاتا تھا۔ لیکن یہاں پر یہ واضح رہے کہ ان چاروں آشرموں کا اطلاق زیادہ تر برہمنوں کی ذات تک محدود تھا۔ علامہ ابوریحان البیرونی نے اپنے مشہور زمانہ سفرنامے ''کتاب الہند'' میں پوری تفصیل ان لفظوں میں بیان کی ہے۔

''برہمن کی زندگی کے چار دور ہیں۔ پہلا دور ۲۵ ویں سال تک رہتا ہے
جس میں تمام لذائذ کو ترک کرنا، زمین پر سونا، کسی گرو سے وید اور اس کی

تفسیر کا علم حاصل کرتا، گرو کی 101 سیوا کرنا، دن میں تین بار غسل کرنا، صبح وشام ہون (پوجا) کرنا، ایک دن برت رکھ کر دوسرے روز برت کھولنا۔ ایک دن میں پانچ گھروں سے اپنی اور اپنے گرو کی بسر اوقات کے لئے خیرات لینا وغیرہ اس کے ضروری فرائض ہیں

۔

دوسرے دور میں (۲۵ اور ۵۰ کے درمیان) وہ یہ اجازت گرو ایسی لڑکی سے شادی کرتا ہے جو ۱۲ سال سے زیادہ عمر کی نہ ہو۔ مہینے میں اپنی بیوی سے ایک بار سے زیادہ ہم صحبت نہیں ہوسکتا وہ اپنی بسر اوقات کے لئے درس وتدریس یا پروہتی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے صلے میں وہ بطور معاوضہ کچھ لینے کا مستحق نہیں بلکہ بخوشی بطور نذرانہ اسے جو کچھ مل جائے اس کا جائز حق ہے۔ وہ کاشت اور کسی ویشے کے ذریعے تجارت بھی کرسکتا ہے۔

تیسرے دور میں (۵۰ اور ۷۵ کے درمیان) وہ دنیوی لذائذ دوبارہ ترک کر کے صحرا نورد ہوجاتا ہے۔ بیوی اس کے ساتھ جائے تو ٹھیک ورنہ اولاد کے سپرد کر دیتا ہے۔ خود ترکاریوں اور جنگل کی جڑی بوٹیوں پر بسر کرتا ہے۔

چوتھے دور میں وہ گیان دھیان میں مصروف رہ کر دوستی ودشمنی کے خیالات دل سے نکال دیتا ہے اور عام طور پر آوارہ گرد رہتا ہے۔

(۳) چاروں ذاتوں کے جو فرائض ہیں۔ وہ تو اپنی جگہ مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ چند دوسرے کام بھی ہیں جو ہر شخص پر فرض کی طرح عائد ہوتے ہیں۔ اور ان کو ترک کرنا بھی روا نہیں ہے۔ یہ یگیہ دان اور تپ ہیں۔

جن کرموں سے ہم دوسرے لوگوں کی ہمدردی اپنی طرف کھینچتے ہیں ان کا نام ''یگیہ'' ہے۔ یگیہ کے اصل معنی پوجا کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کی پوجا کی جائے گی اس کی ہمدردی اپنی طرف کھنچے گی گورو پوجا (تعظیم استاد) اتتھی پوجا (تعظیم مہمان) کے علاوہ پوجا ایشور کی ہوسکتی ہے۔ دیوی دیوتاؤں کی ہوسکتی ہے۔ بڑے چھوٹے آدمیوں کی ہوسکتی ہے۔ حیوانات، جمادات کی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ سب برہم کے روپ ہیں۔ اسی اصول پر یگیوں کی تقسیم

ہے ۔ گویا ہمدردی حاصل کرنے کے سنکلپ کا نام یگیہ ہے اور سنکلپ کے مطابق جو بھی کرم کیا جاتا ہے وہ سب یگیہ میں داخل ہے ۔ وکشنا ، پجاریوں کو زر دینا ، مستحقوں کو کھانا کھلانا یا خیرات دینا ہے ۔ جہاں تک ''تپ'' کا سوال ہے یہ جسم کی ہوتی ہے ۔ بانی یا کلام کی ہوتی ہے ۔ اور من کی ہوتی ہے ۔ یگیہ دان اور تپ کے کرنے میں خصوصاً اور دھرم کے دیگر نیک کاموں میں عموماً شردّھا (صدق عقیدت) کے ساتھ ایک اور امر بھی ضروری ہے کہ آدمی ویدک پرم پوتر منتر ''اوم تت ست'' کہے ۔

(۴) ہندو مذہب کے مطابق آدمی جیسا کرم کرتا ہے اسی کے مطابق اس کو اس کا پھل ملتا ہے ۔ مرنے کے بعد آتما جسم کثیف چھوڑ دیتی ہے ۔ موجودہ جسم میں انسان جو اچھے برے اعمال کرتا ہے ۔ اسی کے مطابق اس کو پنر جنم ملتا ہے ۔ جو شخص پہلے جنم میں کسی ست کرم کی طرف مائل تھا ۔ ظاہر ہے کہ اپنے دوسرے جنم میں کرم (عمل) کا اور استوار شوق لیکر آئے گا ۔ اگلے جنم میں اور ۔ یہاں تک کہ درجہ کمال یعنی ''موکش'' کو پہنچے گا ۔ مطلب یہ کہ ہندو مذہب تناسخ (آواگون) کا قائل ہے ۔ انسان کو اچھے برے اعمال کے سبب بار بار اس دنیا میں جنم لینا پڑتا ہے جب تک کہ نجات حاصل نہ ہو جائے ۔ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ جانداروں میں سب کی مکتی نہیں ہوتی ۔ کیڑے مکوڑے ، چرند ، پرند ، درند ، دیوتا وغیرہ مکت نہیں ہوتے ۔ مکتی انسان کے لئے ہے ۔ اور انسانوں میں بھی صرف ان کے لئے ہے جو بندھن (قید و بند) کو محسوس کرتے ہیں ۔ اس سے گھبرانے اور نجات پانے کی فکر میں رہتے ہیں ۔ عبارت مختصر یہ کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کسی دوسرے ارذل یا افضل انسان یا جانور کے قالب میں ڈال دی جاتی ہے ۔ بدترین گنہگاروں کے لئے مختلف نرک (دوزخ) کے دروازے کھلے ہوئے ہیں ۔ اور نیک لوگوں کی روحیں ''برہم'' سے متصل ہو جاتی ہیں ۔ انسان کو اس کے افعال کے مطابق کسی دوسری یونی میں پیدا کیا جاتا ہے ۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ وہ نیکی مجسم نہ بن جائے ۔

ویدا یسی دنیا کا خود بھی بتاتے ہیں جہاں ہمیشہ امن و مسرت کا دور دورہ رہتا ہے اور یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ

''برہم کی غیر فانی دنیا ان کے حصے میں آئے گی جو گناہوں سے پاک ہیں

۔انسان کی زندگی کے متعلق اس کی روح کا فلسفہ اس طرح بتایا گیا ہے''۔

''روح انسان کے جسم کا ضروری عنصر ہے۔شہد کے چھتے سے جب مکھیوں کی رانی باہر نکل آتی ہے تو باقی مکھیاں بھی اس چھتے کو چھوڑ دیتی ہیں۔اس طرح انسان کے تمام حسیات روح کے ساتھ ہی باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔جس طرح پرندا پنے نشیمن کی طرف جاتے ہیں اسی طرح روحیں اپنے سے بہتر جسم میں چلی جاتی ہیں''۔

''انسان کے جسم کی بادشاہ صرف روح ہے اور وہ بھی فانی۔روح اسی دنیا میں ہم سے علیحدہ کر لی جاتی ہے۔تاہم وہ برہم کی محکوم رہتی ہے''۔

''جسم سے نکلتے وقت اسے مادّہ اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔لیکن روح اپنی آزادی کے لئے مادہ سے جھگڑتی ہے۔روح کا یہ جھگڑا اسے رفعت کی جانب لے جاتا ہے یا پستی کی طرف اسی سے آواگمن کے مسئلے کی وجودیت کا پتہ چلتا ہے''۔

(۵) ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو مذہب کے ماننے والے بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور کئی دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔یہاں تک کہ قدرتی مظاہر کے ساتھ جمادات ونباتات تک کی پوجا سے بھی گریز نہیں کرتے جب کہ ویدوں میں ایک خدائے واحد اور خالق مطلق کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ویدوں میں صریح طور پر بتایا گیا ہے کہ اگنی (آگ) میں حرارت، اندر (پانی) میں روانی اور وات (ہوا) میں جنبش بغیر برہم کی مدد کے ناممکن ہے۔خدا یا پرم پرمیشور کا وجود اور اس کی معبودیت مسلم ہے۔چنانچہ ویدوں میں استفہامیہ انداز میں کہا گیا ہے:

''وہ کون ہے جسے بھینٹ دی جاتی ہے؟''۔

''وہ جو آسمان کو روشن کرتا ہے''۔

''وہ جس نے زمین کو مضبوطی عطا کی ہے''۔

''وہ جو ہوا کی وسعت سے واقف ہے''۔

پھر دہرایا گیا ہے کہ ''وہی پرمیشور ہے اور ہم اسی کو بھینٹ دیتے ہیں وہی پرمیشور ہے جس کی ہم پرستش کرتے ہیں ۔

پاتن جلی کا ساستر خدا کے متعلق بتایا ہے کہ

''وہ وہ ہے جو ازلی وابدی اور عدیم المثال ہونے کے لحاظ سے انسان کے کسی فعل یا عمل کا محتاج ہیں جس کے صلے میں اس کی طرف سے خوشی یا سکھ کا انعام ملے۔۔وہ رفعتِ مطلق ہے۔۔۔خیر مہن ہے۔۔وہ علیم بھی ہے اور کلیم بھی ۔۔۔اس کا علم ازل سے ایک چلا آتا ہے۔اور ابدالاباد تک ایک ہی رہے گا''۔

(۶) ہندوؤں میں آگ کو بہت متبرک مانا جاتا ہے۔اور اس کی بھی ایک طرح سے پرستش کی جاتی ہے۔وہ آگ کو پھولوں کی بھینٹ دیتے ہیں۔آگ جو چشم زدن میں ہر چیز کو خاکستر کر دیتی ہے۔ ہندو مذہب میں اسے اتنی اہمیت ووقعت اور قدر و قیمت کیوں حاصل ہے۔ جوابی طور پر کہا جاتا ہے کہ آگ بے شک جلانے، ملیامیٹ کرنے اور تباہ کرنے والی چیز ہے لیکن جو بھی چیز اس میں ڈالی جائے وہ اسے جلا کر اس کی اصلیت پر لے آتی ہے۔اور ہر آلائش سے پاک وصاف کر دیتی ہے۔خدا کی عظمت وتقدس اور کبریائی وسچائی کے مقابلے میں انسان تو فقط خطا ونسیان کا پتلا ہے اور آلائشوں کا منبع ہے۔لہذا اس کے حضور میں پہنچنے کے لئے تمام آلائشوں اور ہر قسم کی گندگیوں سے پاک ہونا ضروری ہے۔اور یہ کام ''اگن دیوتا'' بخوبی انجام دے سکتا ہے ۔ویدوں میں اگن دیوتا کے بارے میں بھی منتر ملتے ہیں مثلاً

''اے اگن دیوتا! کیا ہمارے گناہوں کا کچھ کفارہ ہوسکتا ہے؟''

''ہمیں خاک کے مکان میں جانے سے باز رکھ''۔

''رحم کر اے طاقتِ مطلق ہم پر رحم کر'' وغیرہ

ہندو مذہب کے پیروکار موت واقع ہونے پر اسی لئے اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے بلکہ ان کو جلا کر بھسم کر دیتے ہیں۔اور پھر راکھ کو گنگا ندی میں بہا دیتے ہیں کہ اس طرح آلائش اور نجاست سے دور ہو جاتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مردوں کو زیر زمین دفن

کرنے کا رواج ہے۔ ان کے نزدیک 105 یہی بہترین طریقہ ہے۔
عبارت مختصر اب کس کس کا ذکر کیا جائے اور کن کن اصولوں کو برسرِ موضوع لایا جائے ہندوؤں میں تو ۳۳ کروڑ دیوی دیوتا ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر دیوتا کی پوجا پاٹھ کے طریقے بھی جدا جدا ہوں گے۔ واضح ہو کہ ویدک دھرم کے اصول وضوابط عام دسترس سے دور تھے۔ علوم کی زبان سنسکرت تھی جس پر صرف برہمنوں کی اجارہ داری تھی۔ رفتہ رفتہ برہمن دوسرے ورنوں (ذاتوں) پر حاوی ہوتے گئے۔ وہ وعظ و پند چھوڑ کر توہین وتذلیل پر اتر آئے اور اپنے کو بہر پور اشرف وافضل سمجھنے لگے۔ ''بھکشا'' جو صرف بسر اوقات کے لائق لی جاتی تھی۔ اسے یہ لوگ اپنا استحقاق سمجھ کر جبریہ طور پر وصول کرنے لگے اور برہمن کا سوال رد کرنا ایک نا قابل تلافی جرم بن گیا۔ یگیوں میں گڑ بڑیاں پیدا ہونے لگیں۔ مذہبی اعتقادات اور رسومات کا دائرہ تنگ ہونے لگا اور بھی کئی برائیاں در آئیں۔ مذہب جو عوام وخواص دونوں کی بہبودی وبھلائی کے لئے ہوتا ہے وہ صرف خواص تک ہی محدود ہو گیا۔ کورانہ معتقدات اور برہمن واد نے ہندو مذہب کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ انہیں گوناگوں وجوہ سے یہ نتائج برآمد ہوئے کہ جین مذہب اور بودھ دھرم کا آغاز وارتقاعمل میں آیا اور جلد ہی یہ مذہبی فرقے عوام میں مقبول ہو گئے اور ہندو دھرم رو بہ انحطاط ہونے لگا۔

☆☆☆

ہندی کہانی میں دلت مسائل

صادق اقبال
ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی

ملخص

ہندی کہانی کار اپنے یہاں دلت مسائل کو ہمیشہ سے اُجاگر کرتے ہوئے آرہے ہیں۔ پریم چند سے لے کر یہ سلسلہ اب تک مسلسل جاری وساری ہے۔ یہاں پر کچھ ایسی کہانیوں کا ذکر کرنا مقصود ہے جو اسّی کی دہائی کے بعد لکھی گئی ہیں۔ دلت یا شودر جیسے الفاظ کی تلاش کریں تو ہمیں اس کی تاریخ کو پڑھنا ضروری ہے کہ یہ لفظ کیوں کر معاشرے میں رائج ہوا اور اس لفظ کو کون سی قوم یا کس طبقہ کے لیے استعمال میں لایا گیا۔ ہمارا موضوع کہانیوں پر ہے اس لیے تاریخ کی تفصیل میں نہ جا کر مختصر اس لفظ پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے ہمیں معلوم ہو کہ دلت مسائل ہمارے معاشرے کو کتنا متاثر کرتا آرہا ہے۔ اس مسئلے پر اردو ہندی زبانوں کے ادیبوں نے قلم اُٹھایا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں شودر لفظ کا پہلی بار رگ وید میں استعمال ہوا ہے۔ رگ وید میں زمین پر بسنے والے انسانوں کو چار طبقوں میں بانٹا گیا ہے۔ ان کے مطابق ''منھ سے برہمن، بازو سے چھتری، پیٹ سے ویشیہ اور پیر سے شودر کو پیدا کیا گیا ہے۔ شودر قوم کو اس بات کا احساس ہمیشہ دلایا گیا کہ تم پیر سے پیدا ہوئے ہو اس لیے دنیا میں تمہارا کام دوسروں کی خدمت کرنا خاص کر برہمن کی۔ معاشرے میں شودر قوم کی حیثیت نہ کے برابر رہی ہے۔ یہ قوم شہر میں نہیں رہ سکتی بلکہ انہیں شہر سے باہر جنگلوں میں اپنی زندگی گزارنی پڑی۔ شہر میں صرف اس لیے انہیں آنے کی اجازت تھی کہ اپنے سے اعلیٰ قوم کی خدمت کریں۔ جیسے جیسے زمانے میں تبدیلی آئی تو انہیں شودر کی جگہ اور بھی ناموں سے پکارا جانے لگا جس میں اہم لقب دلت ہے۔ دلت کو ہندو قوم میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ دلت ایک الگ ہی قوم بن کر معاشرے میں زندگی گزارنے لگی۔ دلت کے استحصال پر بہت سے ادیبوں نے لکھا ہے۔ جن میں سرفہرست نام اردو ہندی کے ادیب پریم چند کا ہے۔ یہاں پر ہندی میں دلت مسائل پر چند کہانیوں پر تجزیہ کرنا میرا مقصد ہے۔

دلت مسائل پر تو بہت سے افسانہ نگاروں نے کہانی لکھیں ہیں لیکن میں یہاں پر چند ایسے نام کو شامل کر رہا ہوں جن کا تعلق اسّی کے بعد لکھنے والوں کی فہرست میں ہے۔انہیں میں ایک اہم نام اوم پرکاش وال میکی کا ہے۔انہوں نے دلت کے موضوعات پر کئی کہانیاں لکھی ہیں ان ہی میں ایک اہم کہانی ''سلام'' ہے۔''سلام'' کہانی کا اہم کردار ''ہریش'' ہے۔اس کہانی کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کار نے دلت مسائل کو دکھایا ہے۔اور دوسری طرف معاشرے میں قدیم زمانے کی روایت کو بھی ختم کرنے کی ہمت جٹائی ہے۔کہانی تین کردار وں کے ارد گرد گھومتی نظر آتی ہے۔''ہریش'' چوہرا (بھنگی) ذات سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہ پڑھا لکھا ہے۔اس کہانی میں پہلا واقعہ تب پیش آتا ہے جب ہریش اپنے دوست کمل کے گھر کھانے پر ہوتا ہے۔کھانے کے دوران کمل کی ماں ہریش سے اس کے والد کے بارے میں پوچھتی ہے تب وہ یہ جان کر آگ بگولہ ہو جاتی ہے کہ اس کا باپ تو بھنگی ہے اور وہ اسی وقت اپنے بیٹے کمل کو ڈانٹ پھٹکار لگانے لگتی ہے۔کمل کی ماں اسے مارتے ہوئے کچھ اس انداز میں بولتی ہے کہ ''پتا نہیں کہاں کہاں سے ان کنجڑوں کو پکڑ کر گھر لیے آتا ہے۔خبردار جو آگے سے کسی حرامی کو دوبارا یہاں لایا'' اس حادثہ کے بعد دوسرا واقعہ تب پیش آتا ہے جب ہریش کی بارات جاتی ہے۔ اس کی شادی مظفر نگر کے ایک گاؤں میں طئے پاتی ہے۔جب یہ برات لیکر وہاں جاتا ہے تو اس کے ساتھ اُس کا دوست کمل اُپادھیائے بھی ساتھ رہتا ہے بلکہ شادی کا پورا انتظام کمل کے ہی ذمہ رہتا ہے۔بارات میں جب کمل کو چائے کی طلب لگتی ہے تو گاؤں کی ایک چائے دکان پر جاتا ہے۔کمل اپادھیائے چمار تو نہیں لیکن چائے کی دکان پر جس طرح کی گفتگو ہوتی ہے اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے مہذب معاشرے میں انسان کی قدر نہیں بلکہ جات پات دیکھ کر اس کی عزت کی جاتی ہے۔کہانی کا اقتباس ملاحظ ہو:

> ''چائے والے نے وہیں سے جواب دیا۔'' تجھے یہاں چائے نہ ملنے کی۔''
> چائے والے کی آواز میں روکھا پن تھا، جسے محسوس کرتے ہوئے کمل نے تیکھے پن سے پوچھا۔''لیکن تھوڑی دیر پہلے آپ نے کہا تھا، چائے ملے گی۔''
> ''کہا تھا۔۔۔اور اب کہہ رہا ہوں نہیں ملے گی۔۔۔۔۔'' چائے والے نے سختی

سے کہا۔کمل چائے والے کے 108 رویے سے غصہ ہو گیا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔''لیکن بھائی صاحب ہوا کیا ہے۔۔۔؟ کیا میں پیسے نہیں دوں گا۔''

۔۔۔۔۔یوں پیسے شہر میں جا کے دکھاڑاں۔ دو پیسے ہو گئے جیب میں تو ساری دنیا سر پہ ٹھائے گھومو۔۔۔ یہ سہر نہیں گاؤں ہے۔ یہاں چوہڑے چماروں کو میری دکان میں تو چائے نہ ملتی۔۔۔کہیں اور جا کے پیو۔''

اس کہانی میں والمکی نے''سلام'' کی روایت کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔گاؤں میں پشت در پشت سلام کی روایت چلی آ رہی ہوتی ہے۔سلام اس روایت کو کہتے ہیں کہ جب بھی کسی چھوٹی ذات کے گھر میں شادی ہو تو وہ اپنے گاؤں کے بڑہمن کے دروازے پر ایک چکر لاگتا ہے اور اس کے بدلے میں اسے بڑہمن کے گھروں سے تحائف وغیرہ ملتے ہیں۔ جب ہریش کو بھی سلام کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔وہ ایک پڑھا لکھا انسان ہے اور وہ اس رسم ورواج کو نہیں مانتا ہے۔ ہریش سلام کے تعلق سے کچھ اس طرح اپنا رویہ دیکھاتا ہے۔کہانی کا اقتباس ملاحظ ہو:

''ہریش نے تیکھے لفظوں میں کہا۔''آپ چاہے جو سمجھیں۔۔۔میں اس رواج کو خود اعتمادی توڑنے کی سازش مانتا ہوں۔ یہ 'سلام' کی رسم بند ہونی چاہیے۔''۔۔۔۔دوپہر ہوتے ہوتے بات پورے گاؤں میں پھیل گئی۔جمن کے جمائی نے سلام پر جانے سے منع کر دیا۔''

اوم پرکاش وال میکی نے''سلام'' کہانی کے ذریعہ معاشرے کی ان تمام فرسودہ روایت پر ضرب لگائی ہے۔جس کی ہمارے سماج میں کوئی حقیت نہیں ہے۔سماج میں ایسی بہت سی رسم ورواج رائج ہیں جسے زبردستی لوگوں پر عائد کیا جاتا رہا ہے۔خاص کر اعلی طبقہ کے اشرافیہ خاندان نے اپنے سے کم تر طبقہ پر زمانے سے مسلط کر رکھا ہے۔

اوم پرکاش وال میکی کے بعد اگر کسی کہانی کار پر نظر پڑتی ہے تو اس میں ایک نمایا نام جیے پرکاش دَم کا لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں دلت مسائل کو اُجاگر ہی نہیں کیا بلکہ ایسے کئی کرداروں کو تخلیق کیا جو اپنے اُپر ہونے والے ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔اسی طرح کا ایک کردار''رام

ویر سنگھ'' ہے۔ یہ کردار جیے پرکاش کی کہانی ''تلاش'' کا ہیرو ہے۔رام ویر سنگھ کو اپنی نوکری کی وجہ سے گھر سے دور دوسرے شہر میں مقیم رہنا پڑتا ہے جس محلے میں اسے مکان ملتا ہے وہاں زیادہ تر بڑی ذات کے لوگ رہتے ہیں۔اسے بڑی مشکل سے گپتا جی کا مکان کرائے پر مل جاتا ہے۔ کہانی میں کلائمکس تب اور بڑھ جاتا ہے۔جب اس کے گھر میں ایک چوہڑی (بھنگی) کھانہ بنانے کے لیے آنے لگتی ہے۔یہ بات گپتا جی کو پتا چلتی ہے تو وہ رام ویر سنگھ سے شکایت کرتا ہے اور اسے زمانے کی دُہائی دیتا ہے کہ نیچ ذات کے لوگوں کو ہمارے گھر میں آنا منع ہے۔کہانی کا اقتباس ملاحظ ہو:

''انسان تو سب ہیں صاحب! پر انسان، انسان میں بھید ہوتا ہے۔سب انسان برابر نہیں ہوتے۔ ہزاروں سال سے سماج میں یہ بھید بنا ہوا ہے۔سماج کے بیچ سماج کے مطابق چلنا پڑتا ہے صاحب! سماج جن باتوں کو مانتا ہے، ہم کو بھی وہ باتیں ماننی پڑے گی۔اگر محلے میں یہ بات پتہ چل گئی کہ ہمارے گھر کے اندر چوہڑی کھانا بناتی ہے تو مصیبت ہو جائے گی صاحب۔۔۔۔۔۔''

''ٹھیک ہے کھانا آپ بناتے ہیں صاحب! پر مکان تو میرا ہے۔ایک چوہڑی کے داخل ہونے سے رسوئی ناپاک ہوتا ہے میرا تو۔''

کہانی کے اس اقتباس سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کار نے گپتا اور ویر سنگھ کے مکالمے کے ذریعہ یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں ہر انسان کو برابری کا حق ہے۔کوئی اپنے کام سے نیچی اور اونچی ذات کا نہیں بن سکتا ہے۔مکان مالک سے بحث کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ویر سنگھ کو مکان خالی کرنا ہوگا یا پھر وہ اس بھنگی سے کھانا نہ بنوائے۔ویر سنگھ اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ وہ نئے مکان کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔کہانی کار اس موضوع سے انسانیت کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اسّی کڑی کے ایک اہم کہانی کار سوشیلا ٹاک بھورے ہیں جنہوں نے دلت کے مسائل کو لے کر بہترین کہانیاں لکھی ہیں۔''سنگھرش'' کہانی میں جس موضوع کو پیش کیا گیا ہے اس میں ایک ایسا کردار ہے جو معاشرے میں چھوا چھوت نظام سے لڑتا ہے۔کہانی کا اہم کردار شنکر ہے جسے اس بات کا علم نہیں ہوتا ہے کہ لوگ اس سے نفرت بھی کرتے ہیں لیکن جب عمر کے چودہ سال میں پہنچنے کے بعد حقیقتوں سے واسطہ پڑنے پر پتہ چلتا ہے کہ اسکول سے لے کر گاؤں کے افراد اسے نیچ سمجھتے ہیں۔شنکر کم

عمری سے ہی شرارتی قسم کا تھا اکثر وہ محلے میں بدمعاشی کے لیے مشہور تھا جیسے کسی کا کبوتر پکڑ لینا تو کسی دوسرے کے جامن چوری کرنا، آم کے باغات میں جا کر چوری کرنا وغیرہ۔ ان حرکتوں کی وجہ سے گھر پر آئے دن شکایتیں ہوا کرتی تھیں۔ جب یہ بڑا ہوتا ہے تو اسی معاشرے کے لیے باغی بن جاتا ہے۔ اسے کبھی یہ تسلیم نہیں کہ اسکی نانی دوسرے کے گھروں میں کام کرے اور اس کے بدلے میں بچا ہوا کھانا لے کر گھر آئے۔ اسکول میں بھی جب کوئی اسے بُرا بھلا کہتا تو وہ ان بچوں سے لڑ جھگڑ لیتا تھا۔ جب یہ کسی کے گھر جاتا تو اسے نکال دیا جاتا یہ سب دیکھ کر شنکر کو بڑا تعجب ہوتا تھا لیکن وہ شرارتی تھا ہی اسے یہ سب دیکھنے میں بڑا مزا آتا ہے جب وہ کسی کے گھر جاتا ہے تو اس گھر کو لوگ پانی سے دھوتے ہیں کہ پاک ہو جائے۔ جیسے جیسے شنکر بڑا ہوتا گیا اسے سماج کی ان بُرائیوں کا صحیح صحیح اندزہ ہوتا گیا اور وہ اس کے خلاف اپنی آواز کو بلند کرنے لگا۔ اسے اپنے آس پاس کے ان لوگوں سے بہت ہی نفرت ہونے لگی جو چھوا چھوت کو مانتے تھے۔ شنکر اپنی نانی کو ہمیشہ منع کرتا کہ کیوں دوسرے کے گھروں میں کام کرنے جاتی ہو۔ شنکر نانی سے بولتا کہ تم اچھے کپڑے پہن کر گھر میں ہی رہو۔ شنکر اپنی نانی کو ہی گھر سے نکالنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اسے یہ بالکل پسند نہیں کہ نانی دوسرے کے گھر کا بچا کھانا اپنے گھر لائے۔ کہانی کا اقتباس دیکھیں:

> ''نانی نے ناتی کے سامنے اپنی غلطی مانتے ہوئے پیار سے کہا۔ ''ہاں بیٹا، اب میں ایسو نہیں کروں گی۔ تو غصہ مت ہو۔۔۔ میں کپڑا لتا اچھے سے پہنا کروں گی۔۔۔۔ ایسی بری حالت میں نہیں دکھوں گئی''۔ پھر وہ سکون سے سمجھاتے ہوئے شنکر کو بولی۔ ''بیٹا میں نے شروع سے یہی کام کیو ہے۔ سبھی جانے ہیں، میں کون ہوں۔ اب میں یہ کام چھوڑ بھی دوں تو کیا میری ذات بدل جائے گی؟ جو ذات ہے وہ تو وہی رہے گی۔ کام کرو چاہے نہ کرو، کہلائیں گے ہم بھنگی ہی۔''

نانی اور نواسے کے اس مکالمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہانی کار معاشرے میں پھیلے ہوئے چھو چھات مرض کے خلاف اپنی آواز بلند کرنا چاہتا ہے۔ شنکر تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کو اس چھوت چھات سے بھی آزادی دلواتا ہے۔ شنکر اپنی محنت ولگن سے کامیاب ہوتا ہے اور اسے وزیر تعلم سے اعزاز بھی ملتا ہے۔ شنکر کی زندگی اس راہ پر آ چکی تھی کہ معاشرے میں اس سے کوئی بھی دور نہیں بھاگتا ہے بلکہ ہر ذات کے لوگوں کے ساتھ راہ رسم تھی۔ افسانہ نگار نے شنکر کردار کو ایک شنگھرش کا استعارہ بنا کر

معاشرے کی خلا کو ختم کرنے میں کامیاب نظر 111 آتے ہیں۔

موہن داس نیمیش رائے کا شمار ہندی ادب کے اہم کہانی کاروں میں لیا جاتا ہے۔ انہوں نے دلت کے مسائل پر کہانیاں لکھی ہیں۔''اپنا گاؤں'ایک ایسے گاؤں کی کہانی ہے جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ چھوٹی ذات جسے یہی مہذب معاشرے نے بنایا ہے اور وہ اس قبیلہ کے لوگوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔کہانی میں ایک گاؤں لہنا ہے۔اس گاؤں میں چمار ذات کے خاندان رہتے ہیں لیکن دراصل ٹھاکر کی بستی ہے۔یہاں کے ٹھاکر ان دلت لوگوں سے اپنے کھیت وگھر کا کام لیتے ہیں۔اس کے علاوہ دلتوں کے اوپر ظلم بھی ڈھاتے ہیں۔اس کہانی میں گاؤں کے اندر بنیادی سہولیات کے نہ ہونے کے مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اسی وجہ سے گاؤں کے غریب ودلت لوگ شہر کا رُخ کرتے ہیں لیکن شہر میں بھی انہیں بہت سی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔گاؤں سے ہجرت کر کے جو لوگ شہر میں روزگار کی تلاش میں آتے ہیں انہیں یہاں بھی فٹ پاتھ کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔کہانی ''اپنا گاؤں'' میں بیک وقت کئی طرح کے مسائل کو دکھایا گیا ہے۔ایک طرف گاؤں کے لوگ شہر جاتے ہیں تو دوسری طرف جو افراد گاؤں میں رہتے ہیں ان کے ساتھ گاؤں کے ٹھاکر ظلم کرتے ہیں خاص کر دلت عورتوں کے ساتھ اور بھی زیادتی ہوتی ہے۔کہانی کا اقتباس ملاحظ ہو:

> ''سارے گاؤں کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کے ملے جلے اثرات دکھائی دینے لگے تھے۔جس گاؤں نے آج تک کبوتری کا منھ تک نہ دیکھا تھا۔کلائی میں پڑی چوڑیوں کی کھنک سنی تھی۔اسی گاؤں کو اسے مادرزاد ننگا دیکھنا پڑا تھا۔ ٹھاکروں نے چماروں کی بستی میں آکر زور زور سے بولا،ڈیڑھ چمار ہم سے ہی سینہ زوری ہمیں ہی سینا دکھاتے ہو۔''

اس حادثے کے بعد معاملہ یہیں پر نہیں رکتا ہے بلکہ دوسرے ہی دن کبوتری کو ٹھاکر سے دھمکی ملتی ہے۔جب کبوتری جنگل سے لکڑی کاٹ کر واپس ہو رہی تھی تو ٹھاکر کا بیٹا سلطان کبوتری کو پاس بلا کر کہتا ہے کہ 'سن کبوتری تو سیدھے سے کل ہمارے کھیت میں کام کرنے آجانا ورنہ ہم چماروں سے زبردستی بھی کام کروانا جانتے ہیں'اس کے علاوہ ٹھاکر کا بیٹا کبوتری سے بولتا ہے کہ تیرا آدمی تو ہم سے قرض بھی لیتا ہے۔جس کے بدلے تو بیاج چکا ہی سکتی ہے۔اس واقعہ کی خبر جب کبوتری کے شوہر کو لگتی ہے تو وہ

غصہ میں آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور پولیس میں رپورٹ کرانے کی بات کہتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان ٹھاکروں کی پہنچ منتری تک ہے۔ کبوتری کا شوہر سنپت کو بابا صاحب ڈاکٹر امبیڈکر کی باتیں بھی پتا ہے۔ کہانی کا متن دیکھیں:

> ''بھیا ہم سب کب تک کمزور رہیں گے؟ کب تک ہم غلاموں کی طرح رہیں گے۔ تمہیں معلوم نہیں بابا صاحب ڈاکٹر امبیڈکر نے کیا کہا تھا۔ تم نے ان کا نام نہیں سنا ہے۔ ایک دو بار چودہ اپریل پر پروگرام بھی ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا ''غلاموں کو غلامی کا احساس کرادو تو وہ غلامی کی زنجیر توڑ دیں گے۔''

کبوتری کا شوہر یہی سب سوچتے اور بولتے ہوئے پولیس کے پاس جاتا ہے کہ رپورٹ درج کرا سکے لیکن پولیس والے اُلٹا اسے ہی ڈانٹ کر بھگا دیتے ہیں۔ جب پولیس میں چماروں کی شکایت نہیں لکھی جاتی ہے تو سارے چمار مل کر گاؤں خالی کر کے قالندی ندی کے تٹ پر اپنا مسکن بنا لیتے ہیں۔ اس کہانی میں دلتوں پر ہونے والے استحصال کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ایک طرف اُنچی ذات کے لوگ ظلم کرتے ہیں تو دوسری طرف سسٹم بھی ان کی باتیں نہیں سنتا۔

☆☆☆

نیر مسعود کا افسانہ ''بائی کے ماتم دار'' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد کلام
اسسٹنٹ پروفیسر۔ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن
پورنیہ یونیورسیٹی، پورنیہ بہار

ملخص

نیر مسعود اردو ادب کے نامور افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ان کی پیدائش 12 نومبر 1936ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔آپ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے فرزند ہیں۔نیر مسعود نے فارسی زبان میں ایم اے کی سند حاصل کی۔اور اسی سال اسلامیہ کالج میں بحیثیت اساتذہ ان کی تقرری ہوئی۔آپ کو کم عمری سے ہی ادب سے لگاو ہو چکا تھا۔نیر مسعود نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز 1965ء سے شروع کرتے ہی ہیں۔آپ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ محقیق ،مترجم اور ناقدوں کے صف میں نظر آتے ہیں۔نیر مسعود کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سیمیا'' 1984ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔اس مجموعہ کے چھ سال بعد'' عطر کافور'' منظر عام پر آیا۔''طاؤس چمن کی مینا'' آپ کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو 1997ء کو شائع ہوا۔اور آخری افسانوی مجموعہ ''گنجفہ'' 2008ء میں منظر عام پر آیا۔

☆☆☆☆☆

نیر مسوعد کے افسانوں میں واقعات کا بیان دیگر افسانہ نگاروں سے مختلف ہے۔انسان کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے وہ واقعات سے جڑی تمام پہلوؤں پر اس طرح گفتگو کرتے ہیں کہ قصّہ سے ذہن ہٹ کر قاری اس کے طلسمی فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ان کی کہانیوں کے بیان میں دستانوی عنصر غالب آجاتا ہے۔چھوٹی چھوٹی باتوں کو بیان کرنے میں بھی آپ کے یہاں طلسمی فضا قائم ہو جاتی ہے۔نیر مسعود

کا خاصہ رہا ہے کہ جب بھی کسی کردار کا خاکہ پیش کرتے ہیں تو اس کے اطراف کی تمام چیزوں سے قاری کو روبرو کرواتے ہیں۔اور پھر اس کی منظر کشی کرنے کے بعد اصل قصّے کی طرف توجہ مرکوز کراتے ہیں۔وہیں درمیان میں اصل قصّے سے ہٹ کر قارین کو دوسری جانب بھی الجھا دیتے ہیں۔آپ کو اپنے تیسرے افسانوی مجموعہ ''طاؤس چمن کی مینا'' پر 2001ء میں ساہتیہ آکاڈمی سے نوازا گیا۔اور 2007ء میں سرسوتی انعام ملا۔

''طاؤس چمن کی مینا'' میں کل دس افسانے شامل ہیں۔مجموعہ کا پہلا افسانہ ''بائی کے ماتم دار'' ہے۔اس افسانہ کو نیر مسعود نے تین حصّوں پر مشتمل رکھا ہے۔پہلے حصّے میں ایک دلہن کی منظر کشی کی گئی ہے۔اس کے سرخ لباس، سرخ مہندی سے لے کر اس کے زیورات کا ذکر ہے۔وہیں قصّے میں دلہن کی موت کا ذکر بھی آیا ہے۔یہ قصہ واحد متکلم کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔یہ واحد متکلم کو ابتدا میں دلہن کے سراپا کو دیکھ کر اس میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔وہ دلہن کے قریب بیٹھ کر اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو، سرخ لباس کو اور زیورات کو بار بار چھوتا ہے جس طرح اکثر بچے دلہن کے پاس بیٹھ کر کیا کرتے ہیں۔واحد متکلم کو دلہن کے سراپا دیکھنا اس قدر اچھا لگتا ہے کہ تو دوسری طرف اسے دلہن سے خوف بھی آنے لگتا ہے۔واحد متکلم کے ذہن میں ایک قصّہ گردش کرنے لگتا ہے کہ بہت پہلے اس کے خاندان کی ایک دلہن کھن کھجورے کے کاٹنے کی وجہ سے سسرال پہنچنے پر مردہ پائی گئی تھی۔اس خوف نے اسے شادی میں شرکت نہیں ہونے دیا کرتا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد جب اس کا خوف ختم ہوتا ہے تو وہ گھر کے سامنے والے مکان کی شادی میں شرکت کرتا ہے۔جب دلہن کی رخصتی ہوتی ہے تو وہ دلہن اس واحد متکلم سے چمٹ کر رونے لگتی ہے۔اس دوران دلہن کا ہار اس کے شرٹ کی بٹن سے میں پھنس جاتا ہے۔اس طرح اس پر دوبارہ سے دلہن کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔وہ جلدی سے دولہن سے دور بھاگ جاتا ہے اس دوران ہار کی پنکھری اس کے بٹن کے ساتھ آجاتی ہے۔اس واقعے کے بعد پھر سے وہ بیمار پڑ جاتا ہے۔

نیر مسعود نے افسانہ کے پہلے حصّے کو دلچسپ بنانے کے لیے دولہن کے قصّے کا سہارا لیتے ہیں وہیں دلہن کے خوف کا ذکر واحد متکلم کے ذہن میں دوبارا سے لیے کر آتے ہیں۔نیر مسعود کی فنکارانہ صلاحیت کی داد دینی چاہیے کہ ایک ایسے کردار کے ذریعہ خوف طاری کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں جو معاشرے کی بہت ہی خوبصورت شئے دلہن ہوتی ہے۔کبھی بھی ایسا نہیں دیکھا گیا ہے کہ دلہن سے کسی کو

خوف ہواور وہ بیمار پڑ جائے۔کسی بھی قلم کار نے اس خوبصورت کردار کوخوف کی علامت بنا کر پیش نہیں کیا ہے۔دلہن تو ایک ایسی صفت ہوتی کہ اس کے ارد گرد دیکھنے والوں کا جم غفیر ہوتا ہے۔دولہن سے لے کر اس کے لباس اس کے زیورات،اس کی مہندی تمام چیزیں لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوا کرتی ہے۔لیکن نیر مسعود نے قارئن کوخوف میں مبتلا کرنے کے لیے کسی خوفناک شئے کو پیش کرنے کے بجائے دولہن کوموضوع گفتگو بنایا۔اوراس پرایک پوراقصّہ بیان کرڈالا۔لیکن افسانہ کی اصل کہانی دولہن کی کہانی نہیں ہے بلکہ اصل قصّہ تو ''بائی کے ماتم دار'' ہے۔جوافسانہ کاعنوان بھی ہے۔نیر مسعوداگر دلہن کے اس قصّہ کو بیان نہیں کرتے تو بھی یہ ایک مکمل افسانہ تسلیم کیا جاتا۔تینوں حصّوں میں دو کہانیاں چلتی ہیں۔ دونوں قصّہ اوراس کے کردار ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے نہ ہی ایک دوسرے سے کوئی واسطہ ہے۔نیر مسعود جابجا کہانی کوطویل بنانے کے لیے ایک الگ سے قصے کو قاری پر تھوپتے نظر آتے ہیں۔لیکن ایک اہم بات ضرور ہے کہ نیر مسعوداپنی فنکارانہ صلاحیت کی بنا پر واحد متکلم کے ذریعہ تینوں قصوں میں ربط بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔کیونکہ واحد متکلم ہی دونوں کہانی میں اپنی موجودگی رکھتا ہے۔اور چھجے والے مکان کا ذکر بھی دونوں کہانیوں میں شامل ہیں۔اس مکان میں رہنے والے لوگ کرایہ دار ہیں۔وہیں دونوں کہانیوں میں جو کردار پیش کیے گئے ہیں وہ آپس میں رشتہ دار نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔نیر مسعود نے دونوں پڑوسی کے ذریعہ ہمیں یہ باور کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں کہ انسان کس قدر لالچی صفت ہوتا ہے۔جب دلہن مرجاتی ہے تو دلہارات میں دلہن کی قبر خود کراس کے قیمتی زیورات کوحاصل کرنا چاہتا ہے۔اسی طرح جب بائی کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے رشتہ داراس سے چمٹ کر رونے لگتے ہیں اوراسی دوران ہر کوئی مردہ جسم سے قیمتی زیورات نکال لیتے ہیں۔نیر مسعوداس افسانہ کے ذریعہ انسانی لالچ کوواضح طور پر دکھانے کی کوشش کی ہے۔افسانہ کا اقتباس ملاحظ ہو:

> ''شروع میں اس نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا کہ وہ قبر
> میں اترا کیوں تھا۔جب اس کے ہوش زرا زیادہ درست ہوئے تو
> اس نے کہا کہ صرف اپنی دلہن کوایک نظر دیکھنے کے لئے اس نے
> قبر کھولی تھی لیکن پھر اپنے آپ ہی اس نے بتایا کہ وہ قبر کے اندر

اتر کر دلہن کے زیورات اتار رہا تھا۔''(بائی کے ماتم دار،ص،(11)

نیر مسعود کے اس افسانہ کو پڑھنے کے بعد امعلوم ہوتا ہے کہ انسانی دنیا میں احساسات کس قدر ختم ہو چکی ہے کہ ایک ایسا انسان جو اس کی دلہن تھی اس کی موت کا اسے کوئی افسوس نہیں لیکن لالچ وحرس نے اسے نازیبا حرکت کرنے کے لیے اسے قبر میں اتار دیتا ہے۔نیر مسعود کا یہ افسانہ اصل واقعہ سے واسطہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ حرکت انسانی تذلیل،قبر کی بے حرمتی کی داستان ضرور ہے۔ایسے ہی بائی کے موت پر اس کے رشتہ دار غم سے کوسو دور اس کے جسم سے زیورات نکالنے میں لگے رہتے ہیں۔افسانہ کا اقتباس ملاحظ ہو:

''اس میں ایک روتے روتے بائی کے چہرے پر سے منھ ہٹایا تو دوسری نے دیکھا کہ بائی کے کان کا بندہ غائب ہے اس نے پوچھا بندہ کہاں گیا۔عورت بولی جہاں انگوٹھی گئی اور ایک تیسری عورت کی طرف اشارہ کرنے لگی بائی کی انگلی سے انگوٹھی بھی غائب تھی۔''(بائی کے ماتم دار،ص،25-24)

اس افسانہ میں نیر مسعود نے انسانی لالچ کو بڑی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔اور ایک ہی افسانہ میں دو مختلف واقعات کو پیش کر کے ان کے درمیان ایک ایسی کڑی کو ملایا جو دونوں قصّے کا اصل ہے۔

☆☆☆

افسانچہ

محبتِ لاک ڈاؤن

افسانچہ نگار.....ڈاکٹر شیریں فاطمہ کوٹہ (راجستھان)

دہلی ایک ایسا تاریخی شہر جہاں کی رنگینیوں میں دل کھو سا جاتا ہے۔عرش کو چھوتی بلند عمارتیں، بازاروں کی رونقیں، سڑکوں پر گاڑیوں کا مجمہ، تنہہ دل بھی تنہہ نہیں رہتا دلّی سے دل لگا بیٹھتا ہے۔

شہزاد کو بھی کاروبار کے سلسلے میں دہلی جانے کا موقع ملا۔انجان شہر میں بس ایک ہی نام جانا پہچانہ تھا اور وہ تھا واحد۔شہزاد واحد کے گھر پہنچ جاتا ہے۔دروازے کی گھنٹی بجاتا ہے۔کچھ دیر بعد جیسے ہی دروازہ کھلتا ہے۔شہزاد کے ہوش کافور ہو جاتے ہیں۔جب وہ ماہ رخ کو دیکھتا ہے۔لمبے کالی گھٹا جیسے گیسو، نرگسی چشم، گلاب کی پنکھڑیوں سے لب، سرخ رخسار، روشن جبیں، سرو جیسا قد سر سے لیکر پاؤں تک خوبصورتی کی ایسی مثال شہزاد نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔شہزاد ہی کیا کوئی بھی ہوش کھو بیٹھتا۔ادھر ماہ رخ کا بھی یہی حال تھا۔دونوں کی نظریں ملی اور ایک دوسرے کے دل میں اتر گئی۔

شہزاد نے ہوش سنبھالتے ہوئے پوچھا! واحد ہیں؟ شرم سے نظریں جھکا کر ماہ رخ نے جواب دیا جی! اتنے میں واحد آتا ہے اور پوچھتا ہے کون ہے ماہ رخ؟ کوئی آپ سے ملنے آئے ہیں بھائی جان! یہ کہہ کر ماہ رخ اندر چلی جاتی ہے۔لمبے عرصے بعد اپنے دوست سے ملنے پر واحد بہت خوش ہوتا ہے۔اور اس کی خوب خاطر کرتا ہے۔شام کو شہزاد اپنے ہوٹل چلا جاتا ہے جہاں وہ ٹھہرا تھا۔لیکن رات بھر وہ سو نہیں پاتا۔ماہ رخ کا معصوم چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ادھر ماہ رخ بھی اسی الجھن میں رات بھر کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔

ابھی کچھ روز ہی گزرے تھے کہ کورونا وائرس نام کی وبا نے ہندوستان میں پیر پھیلانا شروع کر دئے۔دہلی میں بھی اس کا اثر زور پکڑنے لگا۔اس کے چلتے وزیرِ اعظم نے پورے ملک میں لاک ڈاؤن کا فرمان جاری کر دیا۔سب کچھ بند کر دئے گئے۔یہاں تک کے شہزاد کا ہوٹل بھی بند ہو گیا۔جیسے ہی واحد کو اس بات کی خبر ہوئی وہ فوراً شہزاد کو اپنے گھر لے آیا۔اب شب و روز ماہ رخ شہزاد کے سامنے تھی۔دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے بے پناہ محبت تھی نہ ماہ رخ کہہ پاتی تھی اور نہ شہزاد اپنی محبت کا اظہار کر

پاتا تھا۔ دونوں اندر ہی اندر اس آگ میں جل رہے تھے ۔یہ لاک ڈاؤن جہاں کئی پریشانیاں اور مصیبتیں لے کر آیا تھا وہیں اس نے دو معصوم دلوں کو بھی ملایا تھا۔آخر یہ لاک ڈاؤن بھی کب تک جاری رہتا ایک نا ایک دن اسے ختم ہی ہونا تھا۔شہزاد کو نہ چاہتے ہوئے بھی واحد کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر لوٹنا پڑا۔اب تو شہزاد کی کیفیت کسی شاعر کے اس شعر کی مانند تھی ۔

اب اس سے بڑھ کر گناہِ عاشقی کیا ہوگی
جب رہائی کا وقت آیا تو پنجرے سے محبت ہو چکی تھی

اور آج بھی شہزاد اور ماہ رخ دونوں اپنے اپنے حصار میں قید اپنی محبت پہ قائم ہیں۔

☆☆☆

مَنّت ٹیلرس

کہانی کار: ڈاکٹر پرگیہ روہینی
ترجمہ: حفیظ بن عزیز
ایسوسی ایٹ پروفیسر کروڑی مل ڈگری کالج، دہلی

''یار! شکھا کہاں ہو؟ یہ کس سائز کی شرٹ لے آئی ہو؟ سوچا تھا آج کے خاص پروگرام میں اسے پہنوں گا لیکن.....! اب کیا کروں؟'' میرا غصہ شکھا پر پھٹ پڑا۔ سوال کی شکل میں میری ساری جھنجھلاہٹ شکھا کے کانوں کے راستے ریڑھ کی ہڈی کے عین نیچے پہنچ کر درد پیدا کرنے لگی۔ اکثر یہی ہوتا ہے۔ پچھلے نہ جانے کتنے برسوں سے ہر بار ایک نئی شکل میں یہ درد اٹھتا رہا تھا اور ہر بار نہ وجہ پرانی پڑتی تھی نہ ہی تکلیف۔ ہمیشہ لگتا یہ آخری بار ہے لیکن نہیں۔ اس درد کو شکھا سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ آج بھی میں نے شکھا کے چہرے پر درد کی لکیریں صاف دیکھ لی تھیں اور اس کی وجہ تھی میرے لئے خریدے گئے ریڈیمیڈ کپڑے۔ کنبہ کے دوسرے لوگوں کے لئے کپڑے خریدنا ایک شوق یا نشے سے جہاں کم نہیں تھا وہیں میرے اور شکھا کے لئے یہ وبال جان تھا۔ میری نکتہ چینی سے دوکانداروں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور اُن کی بدتمیزی سارے باندھ توڑ کر اُبل پڑتی۔ اس اُبال کو بھی میں لگاتار چیلنج دیتا۔ اسی لئے ایک دوکان میں اُٹھا یہ اُبال آگے کے تمام راستے بند کر دیتا۔ کبھی رنگ، کبھی کپڑے، کبھی سِلائی، کبھی مارجن کو لے کر میری اچھی خاصی بحث سے عاجز آ چکی شکھا اب خود ہی یہ جوکھم اٹھانے لگی تھی۔ شرٹ خریدنے کی راہ تو شکھا کی محنت سے کچھ آسان ہو گئی تھی لیکن ٹراؤزرس کا جھنجھٹ عذاب بن چکا تھا۔ مجھے کوئی نہ کوئی نقص دکھائی ہی دے جاتا۔ سمجھوتا اس بات پر ہوا کہ جینس خرید کر ہی کام چلایا جائے۔ تھوڑی ڈھیلی یا تنگ ہونے پر بھی جینس کئی عیب چھپا لیتی ہے، بالکل کرتہ اور پائجامہ کی طرح۔ یہاں تک کہ شادی بیاہ میں بھی میں جینس پہنتا۔ یوں تو شہر میں درزی بھی تھے لیکن درزیوں کے لئے میرا پیمانہ ذرا اونچا تھا۔ اچھے درزی کی تلاش، وقت کی قلت کے بڑھتے ہوئے کوفت نے دھیرے دھیرے مجھے ریڈیمیڈ کپڑوں کی طرف دھکیل دیا۔ آج تک کا ریکارڈ تھا کہ میں کبھی اپنے لئے لائے کپڑوں سے خوش نہ ہوا اور جب سے شکھا نے یہ بوجھ اٹھا لیا تو سوائے اس کے حصہ میں درد کے اور کچھ نہ آیا۔

''سمیر! میں نے کہا تھا ٹرائی کر لینا۔ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو، لیکن کوئی سُنے تب نا؟'' شکھا کا سوال سن کر میں ذرا تھما، مجھے یاد آیا جس دن شرٹ آئی تھی اس کے آسمانی رنگ پر ہلکی سفید لائن کا ڈیزائن مجھے بہت پسند آیا تھا اور میں پیکنگ کھول کر کوئی خطرہ نہیں مول لینا چاہتا تھا، جیسے کہ مجھے خوف ہو کہ پیکنگ کھولتے ہی کوئی دھماکا ہو جائے گا۔ اُس وقت میں نے شکھا کی بات پر توجہ ہی کہاں دی تھی اور شرٹ پر بیالیس (۴۲) سائز دیکھ کر ٹرائی کرنے کے جھنجھٹ سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ ویسے میرے جسم میں پیٹ کا حصہ چالیس سے زیادہ اور بیالیس سے کچھ کم سائز کی شرٹ میں راحت محسوس کرتا تھا۔ لیکن آج شرٹ کی جانچ کرتے ہوئے میں نے پایا کہ بیالیس سائز کے نیچے چھوٹے حرفوں میں لکھا تھا ''سلِم فِٹ''۔ اب شکھا پر میرے غصہ کی وجہ مضبوط ہو گئی تھی۔

''اُس وقت نہیں دیکھ سکتی تھیں تم؟''

شکھا بھی چُپ نہیں رہی، ''ریگولر فِٹ اب نہیں چلتا، دَور بدل رہا ہے۔ خود ہی لے آیا کرو تم۔'' اپنے اوپر آفت آتی دیکھ غصہ کو شکھا کی بجائے دوکانداروں اور کمپنیوں کی طرف موڑتے ہوئے اُن کی کھال کھینچنے لگا۔ ''ہر روز نیا فیشن بازار میں اتارنے کا پینترا ہے یہ سلِم فِٹ۔ ارے فِٹ ہی ہوتے تو اڑتیس پہنتے نا؟ اچھی شوشے بازی ہے۔ چالیس کے آس پاس یہاں کتنے فیصد آدمی ہیں سلِم فِٹ پہننے والے؟ اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں ٹی-وی چینلز اور فلموں میں ہی سب فِٹ دِکھتے ہیں اور میں اُن میں نہیں ہوں جو یہ مان لوں کہ جسم کچھ نہیں کپڑا سب کچھ ہے۔ جسم کے لئے کپڑا ہے نا کہ کپڑے کے لئے جسم؟''

شکھا سے ناراض ہونے کے باوجود مجھے پتہ تھا کہ شرٹ کمپنیوں کا کچھ نہیں بگڑنا، اُنہیں تو ہر دن نیا دھما کہ کر کے دوکانداری کو بڑھانا ہے۔ اُنہیں کیا پرواہ کہ کوئی سمیر اُن سے اس قدر خفا ہے۔ مجھے سمجھ میں آنے لگا شرٹ کمپنیوں پر فرق نہ پڑنے کا سبب۔ ہزاروں طرح کے برانڈ اترے ہوئے ہیں بازار میں۔ اُن میں بھی دیسی کمپنیوں پر ودیشی بھاری۔ بھاگ دوڑ کی زندگی نے بازار کے پرانے چلن ''انتظار'' کو کب کا رخصت کر دیا تھا۔ اب کون جائے کپڑے سِلوانے؟ کسٹمرز کی بے صبری نے جہاں اپنی آنکھوں پر خود ہی پٹی باندھ لی وہیں چلتے ہوئے ڈیزائنوں نے اُس کی آنکھیں چوندھیا دیں اور پھر اگر اُس پر ''غیر ملکی'' مہر لگی ہو تو غلطی کمپنیوں کی کہاں ہو سکتی ہے؟ مزید یہ کہ پرانے بازار کا چلن کب کا ختم ہو چکا ہے جہاں دوکاندار گراہک کو بھگوان مانتا تھا۔ خریدار کے حقوق اور دوکاندار کے فرائض کو جکڑے پیار اور یقین کی ڈور کے لئے

نئی چکاچوندھ نے کوئی جگہ ہی نہیں رکھی تھی۔ نئے بنتے بازاروں نے سب سے پہلے پرانے اوصولوں کو اکھاڑ پھینکا اور رہی سہی کسر آن لائن شاپنگ نے پوری کردی۔ گراہک کا رتبہ تو ختم ہوہی چلا تھا اب اس کی شکل وصورت بھی مٹادی گئی۔ اب منظر پسِ منظر تھا۔ نہ مالک، نہ سیلس مین، نہ مول بھاؤ بس ایک ''کلِک'' پر دنیا بھر کا بازار آپ کے گھر۔ ظاہری طور پر سب کچھ خریدار کی آسانی کے لئے ہے مگر اس کی آڑ میں زمانے کو بے صبر بنایا جارہا تھا۔ خریداری کی کھجلی فوراً مٹانے کے لئے دن رات کے کسی بھی لمحہ میں بس ایک ''کلِک''۔ فیشن کی اندھی دوڑ نے گھروں میں کپڑوں کا انبار لگا دیا ہے۔ کبھی گھر بھر کے کپڑوں کے لئے ایک الماری ہوا کرتی تھی، آج ایک آدمی کو ایک الماری کم پڑتی ہے۔ اس کا ایک ہی راستہ ہے الماری میں جگہ بنانے کے لئے پرانے کو جلد پھینکو اور نئے کو اس میں بھرو۔ مرضی اور ضرورت دونوں کے معنی ہی بدل گئے ہیں پھر درزیوں کی آسمان چھوتی سِلائی سے مہنگائی کے لفظ کو جوڑنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ دو قمیص کے کپڑوں اور سِلائی کی قیمت میں وہ ایک قمیص خرید کر آسانی سے ٹھگے جارہے ہیں۔ سبھی بے پروا، ''بائے وَن گیٹ فور'' کے شور میں جھوم رہے ہیں۔ ''سیل'' کا بورڈ دِکھا نہیں کہ باچھیں کِھل گئیں، جبکہ کسی وقت میں دیوالیہ ہونے پر دوکاندار ''سیل'' کا بورڈ لگا کر دھندے میں لگائی اپنی اصل رقم بچالیتا تھا، لیکن آج؟ کیا سب دیوالیہ ہوگئے ہیں؟

میرے گھر کے لوگ خاص طور سے میری ماں اکثر کہتی ہیں ''تو سبھی عادتوں میں بالکل اپنے پاپا کی طرح ہے۔ شکل صورت تو ملتی ہی ہے سیرت بھی اُنہیں پر گئی ہے۔ تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ کپڑوں میں تو بھی اُنہیں کی طرح مین میخ نکالنے والا نکلا۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اڑیل قسم کے خبطی تھے تو اُن سے تھوڑا کم ہے۔ نئے زمانے کے ساتھ چلنا اُنہیں کبھی راس نہ آیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا پاپا کی عادتوں کو۔ جب تک جِئے کپڑوں کو لے کر بیحد سنجیدہ رہے۔ اچھے سے اچھے کپڑے سلواتے مگر نئے فیشن پر جان نہ دیتے۔ جو اُنہیں اچھا لگا وہی اُن کے لئے زندگی بھر فیشن رہا۔ سستا اور ٹکاؤ، کپڑے کے بارے میں اُن کے یہی دو پیمانے تھے۔ کپڑا خریدتے وقت دونوں ہاتھوں سے وہ کپڑے کو کھینچ کر دیکھتے پھر ڈھیلا چھوڑتے اور پھر کھینچتے۔ کپڑا پھٹ پھٹ کی آواز کرتا۔ یہ آواز جتنی زور سے ہوتی پاپا کی مسکراہٹ بھی اُسی حساب سے چہرے پر پھیلتی جاتی۔ کپڑے کی مضبوطی جانچنے کا یہ اُن کا اپنا ہی طریقہ تھا۔ اس کے بعد بھی وہ دوکاندار کے قینچی اٹھانے سے پہلے اُسے پردے کی طرح کپڑا اپنے ہاتھوں کے راڈ پر ڈالنے کے

لئے کہتے تا کہ کسی بھی کمی کو اُن کی آنکھ پرکھ سکے۔ مجال ہے اس سب کے چلتے کپڑے میں کوئی معمولی سا نٹ بھی اُن سے چھپی رہتی۔ رہی بات کپڑے سِلوانے کی تو صحیح سائز، اچھا خاصا مارجن اور مضبوط سلائی ہی اُن کی شرط رہتی۔ برسوں بعد جب کپڑا پھٹتا تو وہ اس کے اندر کی سلائی لوگوں کو دکھاتے ''دیکھ لو! کپڑا پھٹ گیا لیکن سلائی نہیں اُدھڑی۔'' ایسا کر کے انہیں نہ جانے کون سی روحانی خوشی مِلا کرتی تھی۔

پاپا کی میٹھی یاد کے باوجود صبح کے اس ناخوشگوار واقعہ نے میرا سارا موڈ خراب کر دیا تھا۔ ساتھ ہی شکھا کے شرٹ کے نہ بدلوانے کے دوٹوک جملوں نے مجھے اور زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ آنے والی چھٹی کا پورا دن مجھے شرٹ کے جھنجھٹ میں برباد دکھائی دینے لگا۔ شکھا کی جان تو بچ گئی لیکن ہوا وہی جس کا مجھے اندیشہ تھا۔

''کوئی ڈھنگ کا ڈیزائن دکھاؤ نا؟''

''سبھی ڈھنگ کے ہیں لیکن آپ کی پسند میری سمجھ سے باہر ہے سر۔'' کاؤنٹر پر لگے ڈبوں کے ڈھیر، چھٹی کے دن گراہکوں کی آمد و رفت اور سامنے سے گھورتے باس کی نظروں نے سیلس مین کا سارا صبر ختم کر دیا تھا۔ مال بیچنے کی ساری ترکیبیں اس نے پہلے ہی کر ڈالی تھیں، اب شرٹ بدلے نہ بدلے اس کی بلا سے۔ دوکانداری کے کچھ نئے سخت قوانین سے وہ بھی واقف تھا۔ اس کے چہرے پر اُبھرنے والی سخت لکیریں مجھے برداشت نہ کر پانے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ لیکن ان سب کے باوجود میں ہمت کئے ٹکا رہا۔

''ایک تو غلط چیز دیتے ہو اور بدلے میں کچھ اچھا نہیں دِکھاتے ہو۔ اتنے بڑے برانڈ کس کام کے؟'' مجھے اپنے وقت اور شرٹ کے دو ہزار روپے کا نقصان بری طرح کھٹک رہا تھا۔ جھگڑے اور جھنجھٹ سے بچنے کے لئے میں نے مال کے دوسرے کاؤنٹر سے بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک چادر خرید لی۔ باہر نکل کر میں نے دیکھا کنکریٹ کے دور تک پھیلے اس ریگستان میں مالز کے اَن گنت گھورے کھڑے ہیں۔ جہاں دیکھو وہیں خوبصورت عمارتیں، خوبصورت عمارتوں میں بڑھتے ہوئے گراہک۔ گراہکوں کی بھاری جیبوں پر دوکانداروں کی للچائی نظریں، مگر گراہک کا اطمینان و آرام؟ وہ ریگستان میں دفن ہے یا بکھرا پڑا ہے ریزہ ریزہ ہو کر قدموں کے نیچے اور ہوا میں اُڑ رہی ہیں دیسی جیبیں اور چندی برابر ٹیگ پر سوار، اڑتے ہوئے سرحد پار پہنچ رہی ہیں بھاری بھرکم جیبیں۔ میں مال سے باہر آ گیا، اسکوٹر اسٹارٹ کیا میری نگاہیں تو سڑک

پر تھیں لیکن دِل دماغ کہیں اور تھا۔

اچانک مجھے یاد آیا پرانی بستی کا اپنا وہ بازار جو گھر سے کچھ ہی دور تھا لیکن بچپن میں وہ ذرا سی دوری میلوں کی دوری معلوم ہوتی تھی۔ ننھے قدم بازار کی اُس دوری کو طے کرنے میں ہی تکان سے بھر جاتے تھے۔ بازار کا مطلب ضرورت کی پندرہ بیس دوکانیں جو گھروں کے نیچے سہولیت کے لئے کھول لی گئی تھیں۔ ہر محلّہ کا چھوٹا سا اپنا بازار۔ جہاں ہر گھر کے بچے تک کو دوکاندار پہچانتا تھا اور ادھاری کھاتے خوب چلا کرتے تھے۔ کچھ دوکانیں تو بڑی آڑی ترچھی تھیں جیسے کپڑے میں کوئی کان نکل آیا ہو، اور صاف ظاہر ہوتا کہ گھر کے فاضل حصہ کو دوکان کے لئے نکال لیا گیا ہے۔ نہ تو آج کے جیسی خوبصورتی اور نہ تیز روشنیوں کی چمک دمک، دوکاندار بھی کیسے معمولی کپڑوں اور سیدھی سادی شکل میں ایکدم بے فکر۔ کوئی دوکان میں تخت ڈالے ادھ لیٹا سا تو کوئی باہر ہی کرسی ڈالے دوسرے دوکانداروں کے ساتھ باتوں میں مست، گپّوں میں ڈوبا وہ گراہک کو ہاتھ کے اشارے سے سمجھا دیتا کہ وہ سامان لے کر پیسے گلک میں ڈال دے۔ کوئی کوئی تو ایسا کہ گھنٹوں کے لئے دوکان سے غائب۔ دوکان اکیلی چھوڑ اندر سونے چلا گیا، یا کہیں کسی کام سے باہر۔ وہ آج شہر کے دوکانداروں جیسے نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا چھوٹے سے محلّہ میں چند دوکانیں ہیں مال بکنا ہی ہے اور جب سب اتنے جان پہچان کے ہیں تو کیا سجنا سنورنا؟ لیکن انہیں کہاں معلوم تھا کہ زمانہ کروٹ بدلے گا اور محلّہ میں دوکانیں نہیں دوکانیں ہی محلّہ ہو جائیں گی۔ دوکاندار کے ذریعہ مجھے زبردستی کا خریدار بنائے جانے اور پھر لُٹنے کے احساس نے مجھے بچپن کی ایک ایک باتیں یاد دلا دیں۔ لگ رہا تھا یہ یادیں آج مِلے تازہ زخم پر پھائے کا کام کریں گی۔ اسی لئے میں نے خود کو یادوں کی گلیوں کے سپرد کر دیا۔

اُنہیں گلیوں میں جو چہرہ نمودار ہوا وہ چہرہ تھا رشید بھائی کا۔ وہ محلّہ میں ہی کہیں رہتے تھے۔ ویسے تو محلّہ میں گنتی کے کُل چار بلاک تھے لیکن بچپن میں مجھے وہ کسی شہر جیسا ہی بڑا لگتا تھا۔ شہر کے ایک پرانے بازار میں منت ٹیلرس کے نام سے مشہور اُن کی دوکان پر والد صاحب کے ساتھ میرا اکثر جانا ہوتا تھا۔ اُس وقت میری عمر اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی، سمجھتا سب کچھ تھا اور ممی پاپا کے ساتھ خریداری کے چکر میں بازار کے چپے چپے سے واقف بھی ہو گیا تھا۔ وہاں پونم ٹیلرس اور آشیانہ ٹیلرس کے ہوتے ہوئے بھی منت ٹیلرس کی بات نرالی تھی۔ جینٹس کپڑے سیے جانے کی اول درجہ کی دوکان تھی منت ٹیلرس۔ والد

صاحب کے لئے وہ کسی منت سے یوں بھی کم نہیں تھی ۔دوکان کی چوکھٹ پر آ کر کپڑوں کی سلائی کو لے کر اُن کی تمام شکایتیں دور ہو جاتی تھیں اور دوکان کے اندر بکھرا ملتا رشید بھائی کے حسنِ اخلاق کا نور۔ مجھے اُن کی دوکان میں آتی نئے کپڑوں کی مہک بہت اچھی لگتی ۔ بازار میں منت کے دن بہ دن نکھرتے حُسن سے گھبرا کر پونم ٹیلرس نے مَردوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے کپڑے بھی سینا شروع کر دیا تھا۔ اور آشیانہ ٹیلرس کا فیروز تو پوری کاروباری مہارت کے ساتھ لیڈیز ٹیلرس کی شکل میں بازار میں اترا تھا۔ ممی اس کے علاوہ اور کہیں نہیں جاتی تھیں ۔ وہ لچھے دار باتوں کی کھاتا تھا لیکن تھا اپنے کام میں ماہر۔ پتلے، لمبے جسم سے نکلتی اُس کی موٹی سی آواز، رنگ برنگی شرٹ کے کچھ کھلے بٹن اور بالوں پر ہر وقت اٹکا دھوپ کا چشمہ، کچھ الگ ہی اتراتا ہوا اسٹائل ۔اُس وقت بھی بازار زیادہ نفع کمانے کے چکر میں رہتا تھا لیکن اس نفع پر بہتر کام کو فوقیت دی جاتی تھی اور بھروسہ واطمینان کو قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ پاپا بتاتے تھے کہ ''کوئی کچھ بھی کرے رشید بھائی بے پروا رہتے ،اُن کے گراہک کو توڑنا ناممکن ہے۔'' رشید بھائی کاریگر آدمی تھے۔ ہاتھ کسی کپڑے کو چھو بھر لے ایک جادو سا ہو جاتا۔ کرتے پائجامے میں وہ سلیقہ اتار دیتے کہ آدمی کی چال ہی بدل جاتی اور معمولی کپڑے کو نئے ڈیزائن کے پینٹ شرٹ میں بدل دیتے۔ کوٹ پینٹ تو کیا کوئی اُن کے جیسا سِل پائے گا۔ ایک نہیں ہزار جنم بھی لے تو رشید بھائی کا ہنر کاپی نہ کر پائے کوئی۔ کسی کو چھوٹے پائنچے کی پینٹ پسند ہے تو کسی کو بیل باٹم۔ کسی کو ہوا میں جھولتے بڑے بڑے کالر کی قمیص چاہئے تو کسی کو گردن سے چپکا بند گلا۔ کسی کو ایکدم چست کپڑا چاہئے تو کسی کو ڈھیلا ڈھالا۔ رشید بھائی ساری سیواؤں کے لئے حاضر۔ اُن کے ہاتھ کا سلا کپڑا گراہک کے بدن سے لگتا تو اطمینان اور خوشی کے مِلے جُلے رنگ فضا میں گھل جاتے۔ اُس وقت آج کی طرح بچے، جوان اور بوڑھے آدمیوں کے لئے ایک جیسا فیشن نہیں تھا۔ پہننے والے کی پسند پہلے ہوا کرتی تھی نہ کہ کسی کمپنی کی جبراً تھوپی گئی پسند کو اپنانے کی مجبوری۔ رشید بھائی کی چھوٹی سی دوکان میں دیوار سے لگی الماریوں کے کانچ کے پلّوں کے اندر امیتابھ بچن، دھرمیندر، جیتیندر وغیرہ کی دلکش لباسوں والی تصویر پر بس رشید بھائی کے ہاتھ رکھنے اور گراہک کی ہاں میں گردن ہلنے کی دیر بھر ہوتی، جادو الماری سے نکل کر گراہک کے بدن پر اتر جاتا۔ جس کی جیسی پسند۔ رشید بھائی نے ''کھاؤ من بھاتا پہنو جگ بھاتا'' والی کہاوت کو بدل دیا تھا۔ اُن کے لفظوں میں ''کھاؤ بھی من بھاتا اور پہنو بھی من بھاتا۔'' بس انہیں جملوں پر پاپا کا دِل اُن سے مِل گیا تھا۔ جگ بھاتے کو پاپا بس

اُتنی ہی اہمیت دیتے جس میں جگ ہنسائی نہ ہو۔ پاپا کے ہر لفظ پر میرے کان رہتے تھے اور اُن کی بہت سی باتوں میں رشید بھائی کے معاملے میں بار بار دہرائے گئے جملے میرے دماغ میں ڈیرا ڈال چکے تھے۔ ہر بات میں اُن کی ہنرمندی کی تعریف۔ ورنہ اُس بازار میں یوپی کے دور دراز علاقوں سے آئے کتنے ہی رشید گھوم رہے تھے۔

''آج شام تیار رہنا سمیر، رشید بھائی کے یہاں جانا ہے کپڑے ڈالنے۔''

اُس دن پاپا کے کہے جملے دِل میں کتنی خوشیاں بھر گئے تھے۔ بات اُس وقت کی ہے جب بازار جانا اور نئے کپڑے سلوانا کسی نوابی شان سے کم نہ تھا۔ لیکن ممی نے کپڑا تو دکھایا ہی نہیں؟ ''ممی! وہ کپڑے تو دکھانا جو آج شام میرے لئے ڈلوانے ہیں۔ کب گئیں بازار، کب لائیں کپڑا؟'' تب زمانہ کفایت کا تھا جسے آج کی بولی میں کنجوسی نہیں سمجھا جاتا تھا اور میرا گھر زمانے کی کفایت کے نقش قدم پر تھا۔'' تیرے بھیا کی ایک اور پاپا کی دو پینٹیں نکالی ہیں سِلوانے ڈال آ۔'' میرے سوال کا جواب مِل گیا تھا اور میں کھیل میں مگن ہو گیا۔ شام کو پاپا کے ساتھ جاتے ہوئے میں نے تینوں پینٹوں پر غور کیا۔ والد صاحب کی پینٹوں سے میری پینٹ نکل آنے میں مجھے شک نہ تھا لیکن بھائی کی پینٹ؟ کھلے کھلے پائینچے کی نیچے سے گھسی پینٹ سے کیسے بنے گی میری پینٹ؟ میں بڑا ہو رہا تھا اب کوئی بچہ نہیں تھا ،لیکن کس سے بانٹتا اپنی اس فکر کو۔

مجھے یاد ہے اس دن بازار پہنچ کر میری فکر اُن گلیوں میں کچھ دیر کے لئے نہ جانے کہاں گُم ہو گئی تھی۔ کتنے قسم کے نظاروں سے بھرا تھا وہ سنسار۔ ہمیشہ کی طرح میں اس میں کھو جانے کو بیتاب تھا۔ کتنے طرح کے کام ایک ساتھ چل رہے تھے۔ رشید بھائی کی دوکان جس گلی میں تھی کیا رونق تھی اس کی۔ سڑک سے کچھ پہلے کی دوکانیں بھی دیکھنے کے لائق تھیں۔ کتنی طرح کی کڑھائی کے کام وہاں چلتے تھے۔ سڑک کی شروعات سے ہی دونوں طرف کہیں ہاتھ کی کڑھائی کا بھاری کام، کہیں گوٹا، کانچ اور سلمہ-ستارے کا کام، کہیں کاج بٹن کا کام کہیں زردوزی کی کڑھائی اور زری کا باریک کام۔ میں بہت دیر تک اُن کاموں کو دیکھتا رہتا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی ان کاموں کا حسن جگمگانے لگتا۔ کوئی پکا کاریگر سوئی میں ستارے پرو کر آسمان سجا رہا ہوتا تو کوئی کپڑوں پر اُبھری لکیروں کی بیل بناتا ہوا پورا باغیچہ اس پر اتار دیتا۔ یہ کام مجھے بہت بھاتا تھا۔ گلی کے شور کی دُھن پر کاریگر کے ہاتھ دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف گامزن رہتے۔

میری نظر کبھی بھرواں کڑھائی پر جاتی تو کبھی میں پیڈل مشین پر درزیوں کے پیروں کی رفتار دیکھتا۔ اتنا ہی کیوں کپڑے کے رنگ کی رِیل نکالتے ہی کاریگر کا شٹل میں تاگا بھرنا مجھے بہت اچھا لگتا۔ دھار دار قینچی سے کپڑے پر لگے نیلے نشان پر چلتے ہوئے پھٹا پھٹ لمبائی یا گولائی میں کاٹ دینا مجھے حیرت میں ڈال دیتا۔ پھر کاٹے ہوئے کپڑوں کو کترن کی سُتلی سے باندھ کر دوکان کے آلوں میں ٹھونس دینا مجھے پریشان کرتا، کیسے پہچان ہوتی ہوگی کہ کون سا کپڑا کس کا ہے؟ ساری گلی بھری پڑی تھی انہیں سب کاموں سے۔ چھوٹے چھوٹے سے دِکھنے والے کاموں کی دوکانیں مجھے کبھی خالی نہ دِکھتیں۔ کتنا کام تھا وہاں، سر اُٹھانے کی فرصت نہیں۔ ہر کسی کی خواہش کو کپڑوں میں اتارنے کا کام زوروں پر تھا۔ ایک کام سے منسلک تھا دوسرا کام تھا اور اس سے منسلک تھیں کتنوں کی روزی روٹی۔ ہاتھ کم پڑ سکتے تھے لیکن کام نہیں۔ وجہ کچھ میں جان لیتا تھا اور کچھ پاپا کے ذریعہ معلوم ہو جاتی تھی۔ شہروں میں ان ہنرمندوں کی بڑھتی مانگ کی وجہ سے گاؤں دیہات میں بسے ان کے رشتہ داروں کو بھی ایک ہی جگہ کام مِل جاتا تھا۔ یہاں کام بھی تھا اور دام بھی۔ کتنی دوکانوں میں ناطے رشتہ داروں کا پورا کنبہ ہی لگا تھا۔ خاندان کے خاندان اور خاندانی کام۔ ان دوکانوں کے ساتھ ہی رِیل، بٹن، گوٹا، کرن، بکرم، تمام طرح کے تاگوں، اونچی ٹیپ، کڑھائی کے فریم، چھوٹی اور موٹی سوئی کی چلتی ہوئی کئی دوکانیں تھیں۔ ایک دوکان پر تو سلائی مشینیں ٹھیک ہونے آتی رہتیں۔ اُن کے بڑے- چھوٹے گُل پرزوں سے بھری تھی وہ دوکان۔ کسی کی مشین بگڑ جاتی تو کہیں اور نہ بھاگنا پڑتا۔ بازار چھوٹے چھوٹے کاروباروں کے ساتھ سلائی کڑھائی کا مرکز تھا۔ میں بڑے شوق سے سب کاموں کو دیکھتا رہتا۔ پاپا، رشید بھائی کے یہاں جتنی دیر کام نبٹواتے یا دنیا- جہان کی باتیں کرتے رہتے میں اُتنی دیر گلی میں کھویا رہتا۔ اس وقت آج کی طرح لوگوں کا بے صبر ریلا بازاروں میں نہیں بھاگتا تھا کہ کسی کو آس- پاس کی دنیا کو دیکھنے کی فرصت ہی نہ ہو۔ میں ان سب میں تب تک کھویا رہتا جب تک پاپا کی مجھے پکارتی آواز نہ آتی۔

''رشید بھائی! دو مہینے بعد گھر میں شادی ہے۔ سوچ رہا ہوں اس بار سب لڑکوں کے سپاری سوٹ ہی سلوالوں۔ معاملہ مہنگا ہوگا پر شادی کی بات ٹھہری۔'' ہاتھ میری ناپ پر اور کان والد صاحب کی بات پر دیئے وہ بولے۔ ''ایسا کیجئے ماس ساب! الگ الگ پیس کی بجائے ایک تھان لے لیجئے گپتا جی کی دوکان سے، میرا نام لے کر۔'' اچکچا کر انہیں دیکھتے ہوئے والد صاحب بولے۔ ''یار! ہنسی اڑواؤ گے

ہماری ؟ لوگ شادی کو صرف ایک تھان کے پریوار کی وجہ سے یاد رکھیں گے۔'' والد صاحب کا مایوس چہرہ دیکھ کر مجھے بڑا ترس آیا۔اس وقت رشید بھائی نے مایوسی کے بادل چھانٹتے ہوئے کہا ۔''اطمینان رکھیں آپ !ایک تھان آپ کو سستا پڑے گا اور میں ایسا بنا دوں گا کہ کوئی بتا نہ پائے گا کہ کپڑا ایک ہے.....اور دوکاندار کو پیسہ دینے کی جلدی نہ کیجئے گا۔شادی کا معاملہ ٹھہرا،سو خرچ ہونگے گھر کے، میں بات کرلواں گا۔'' اگلی بار والد صاحب مجھے،تھان اور بھائیوں کو لے کر وہاں پہونچے۔میرا دِل دھڑک رہا تھا پچھلی بار دی گئی بھیا کی پینٹ میرے پہننے لائق ہوگی یا نہیں؟ کہیں دوستوں کے بیچ مذاق نہ بن جائے ،لیکن یہ کیا اُسے دیکھتے ہی میرا من اُس پر آ گیا۔وہ ایکدم نئی پینٹ لگ رہی تھی۔

گلی سے نکلتے ہی مین بازار تھا۔وہاں کپڑوں کی ان گنت دوکانیں تھیں۔ہمارے شہر کی مشہور کپڑا مِل کی چلتی دوکان کے ساتھ دیش بھر کی زیاتر نامی گرامی میلوں کا کپڑا بازار میں موجود تھا۔ان نامی گرامی میلوں کو میں ریڈیو اور ٹیلی ویزن کے اشتہاروں اور اخباروں کے ذریعہ خوب پہچاننے لگا تھا۔ٹی وی تب گھر میں نیا ہی آیا تھا گھر اس لئے کوئی خبر،کوئی پروگرام چوٹ جانا گناہ عظیم تھا پھر کپڑے کے اشتہار میں اپنے پسندیدہ کرکٹ کھلاڑیوں کا ہونا میرے لئے کافی تھا۔یوں ہیروئینوں کے جسم سے آسمان کی طرف میلوں اڑتی تھان نما ساڑی بھی مجھے کم دلچسپ نہیں لگتی تھی۔اُس کا آسمان چھونا میرے لئے کسی معجزہ سے کم نہیں تھا۔

گھر کی اس شادی میں پہلی بار رشید بھائی کو کنبہ کے ساتھ شامل ہوتے میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ان کی بیوی تو نہیں لیکن ان کے دونوں لڑکے اور چھوٹی سی لڑکی آئے تھے۔اسی کے نام پر ہی اُن کی دوکان کا نام تھا''منت''۔اُن کے لڑکے پرویز اور اسلم تو اسی سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے جہاں ہم بھائی پڑھا کرتے تھے اور رشید بھائی کبھی کبھار انہیں پاپا کے پاس کچھ پوچھنے سمجھنے کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔ اُن سے جان پہچان تھی ہی۔میں نے دیکھا،اُس دن رشید بھائی کی آنکھیں خوشی کے اس پل میں اپنی کاریگری کی داد دیتی ہوئی کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھیں۔پاپا اور ہم سب بھائیوں سے لوگوں کی نظر نہیں ہٹ رہی تھی،سب کی تعریفی نگاہیں رشید بھائی کی آنکھوں میں سما گئی تھیں۔سفاری کی چست فٹنگ، ہر سوٹ میں سلائی کا الگ انداز اور اُسمیں میں نکھرتے ہم سب۔پہلی بار سفاری سوٹ پہن کر میں خود کو بارات کا دولہا مان کر اترا رہا تھا۔یوں تو سبھی بھائیوں اور پاپا نے اُسی تھان سے سفاری بنوائے تھے لیکن

مجال ہے جو کوئی بھی اس راز کو فاش کر دیتا۔ رشید بھائی نے اپنے یہاں بننے آئے سفاری سوٹ کے کپڑوں کے بچے ہوئے چھوٹے موٹے پیس سے ہر سوٹ میں کوئی نیا گُل کھلا دیا تھا ۔دو الگ رنگوں کا پیچ بنا کر، کہیں تانا بانا بدل کر انہوں نے صدی کا سب سے بڑا کارنامہ ہمارے نام لکھ دیا۔ اُس پر ہر بار کی طرح پاپا کو عزت بخشتے ہوئے انہوں نے سلائی بھی کم لی تھی۔ پاپا کے پڑھے لکھے ہونے اور ماسٹر ہونے کی قدر اُن کی آنکھوں میں ہمیشہ دکھائی دیتی۔ ہمارے محلے کے تین منزلہ مکان والے دولتمند کپور صاحب کی بھی وہ اتنی عزت نہیں کرتے تھے جتنی ہمارے پاپا کی۔ چھٹی کے دن یا شام کو اکثر دوکان پر بیٹھے ترپائی کرتے اپنے بچوں سے وہ ہمارے سامنے ہی کہتے۔ ''پڑھ لکھ جاؤ ڈھنگ سے تو ماس ساب کی طرح بن جاؤ گے، عزت کی روٹی کمانا، انسان بننا'' اور مجھ سے بھی کتنی ہی دفعہ انہوں نے کہا ''بیٹا اپنے ابا جیسے بننا۔'' پاپا نے بتایا تھا کہ کالج میں داخلہ ملنے کے باوجود رشید بھائی اپنے ابو کے گزرنے کی وجہ سے پڑھائی جاری نہ رکھ سکے تھے۔ اور ذمہ داریوں میں گرفت اپنا پشتینی کاروبار سنبھالنے لگے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی پڑھائی کے لئے اُن کی خلش کبھی مٹ نہ سکی۔ نہ جانے اُن کی دعاؤں کا ہی اثر تھا کہ میں بھی پاپا کی طرح سرکاری اسکول میں ٹیچر لگ گیا۔ لیکن اس حقیقت کو رشید بھائی کہاں جانتے تھے؟ انہیں پتا چلتا تو کتنے خوش ہوتے۔ انیس بیس سال ہو گئے تھے ہمیں وہ محلّہ چھوڑے۔

میں سوچنے لگا رشید بھائی واقعی تعلیم کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ لیکن اُن کے بیٹے؟ آخر کیا بنا ہوگا ؟ بڑا پرویز تو کہیں کلرک - وِلرک لگ بھی گیا ہو شاید لیکن چھوٹا اسلم؟ وہ تو ایکدم نکھٹو تھا۔ اُس کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے رشید بھائی چھٹیوں میں اُسے ترپائی، سلائی سے لے کر کٹنگ تک سکھاتے تھے۔ دور کی نگاہ تھی اُن کی۔ وہ اپنے ہنر کو اسلم میں اتار دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا دیدہ نہ پڑھائی میں لگتا نہ سلائی میں۔ وہ کہتے تھے ''دو پیسے کا کام سیکھ لے گا تو بھیک تو نہیں مانگنی پڑے گی۔'' رشید بھائی جیسا قابل بن پانا سب کے بس بات کہاں۔ پھر ان لوگوں کے یہاں بچے پڑھتے لکھتے ہیں ہی کہاں؟ ان میں پڑھا لکھا طبقہ ہے ہی بہت کم اسی لئے تو اتنے کٹّر .....نہیں رشید بھائی ایسے نہیں تھے۔ رشید بھائی تو اپنی مثال آپ تھے، نکلتا ہے کوئی کوئی ان کے یہاں بھی، اس طرح کے ایک آدھ لوگ مشکل سے ہی سہی لیکن ہاں مِل جاتے ہیں ان میں۔ آج میرا من بار بار رشید بھائی کی فکر میں برف ہو رہا تھا۔ ویسے تو بچوں کا فرض ہوتا ہے ماں باپ کی خدمت کرنا لیکن ان دونوں سے کیا بنا ہوگا؟ پھر رشید بھائی کی کمائی پونجی تو منت کے نکاح میں لگ گئی ہوگی

۔میں نے اندازہ لگایا منت جوان ہوچکی ہوگی ۔شادی کے لائق عمر کی ۔اسی لئے اس کی شادی کے بعد جو رقم باقی بچی ہوگی اُس سے دولڑکوں اور رشید بھائی کی اپنی گاڑی گھسٹ رہی ہوگی جیسے تیسے۔جمع پیسہ کوئی قارون کا خزانہ تو ہے نہیں۔اور منت؟ اچھی صورت اور ڈھنگ کی پڑھائی نہ ہوتو لڑکی کی جلدی شادی کر دینا ہی اچھا ہے۔سیرت-ویرت کون پوچھتا ہے آج کے دَور میں ۔ مجھے اچانک منت کا سانولا پن یاد آ گیا۔اُس کے نین نقش کیسے تھے دماغ پر بہت زور دینے کے باوجود کچھ یاد نہ آیا۔کہاں تک پڑھی ہوگی؟ مدرسہ میں کچھ پڑھا ہوتو پڑھا ہواس نے ۔وہاں کہاں پڑھائی لکھائی؟ تعلیم کے نام پر قرآن پڑھا دیا جاتا ہے بس ۔دین کے ساتھ دنیا کی تعلیم کہاں؟ یہی تو اُن میں اور ہم میں فرق ہے۔پاپا بتاتے تھے کہ اُن کے گھر کی عورتوں نے کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

میں بازار سے گھر لوٹ آیا لیکن میری فکر برابر بنی رہی،اب گزارا کیسے ہوتا ہوگا رشید بھائی کا؟ کیا آج بھی اُن کے وہی ٹھاٹھ برقرار ہونگے ؟اب اتنا کام تو نہیں کر پاتے ہونگے ؟ڈھلتے جسم نے کام کا دامن کب کا چھوڑ دیا ہوگا۔نوکری پیشہ آدمی کی بھی یہ عمر تو رٹائر ہوکر آرام کرنے کی ہوتی ہے۔سرکاری نوکری کے آرام کے بیچ اچانک رشید بھائی کے بچوں کا دھیان آتے ہی میں تذبذب میں پڑ گیا کہ اب بھی بازار میں ان کی دوکان کا وہی سکہ چلتا ہوگا؟ ہاتھ کے کتنے کام اب ختم ہو چکے ہیں پھر اب کہاں بچیں وہ کپڑا مِلیں ؟ شہر کی جانی مانی مِل تو کب کی بند ہو چکی تھی ۔شہر کی اُس مِل کی برسوں خالی پڑی زمین پر اب گروپ ہاؤسنگ سوسائٹی کھڑی ہونے کی خبریں عام ہیں ۔اب بازاروں میں کہاں رہیں وہ کپڑوں کی پرانی دوکانیں۔میرا دِل سوال کرتا کیا بازار کی وہ رونق اب بھی برقرار ہوگی؟ لیڈیز ٹیلرس تو پھر بھی کسی طرح بچے ہوئے ہیں لیکن کتنے جینٹس ٹیلرس کو میں نے خود بیکار ہوتے دیکھا ہے۔ہمارے نئے محلّہ میں چل رہی جینٹس ٹیلرس کی دوکانوں کو میں نے گھسٹتے اور پھر بند ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پاس کے محلوں کے چار پانچ بازاروں میں ایک بھی جینٹس ٹیلرس کی دوکان نہیں ہے۔رشید بھائی کا چہرہ پھر سے دماغ میں ابھرا تو سوچنے لگا،بِلا پینشن والے والد کی سہی مٹی پلید کرتی ہیں اولادیں ۔بڑھاپے میں کتنے بے عزت ہونا پڑتا ہے اپنی ہی اولادوں سے۔رشید بھائی بھی ہو رہے ہونگے ۔شکر ہے ہم بھائی نہیں بہے اس بے درد ہوا کے سنگ لیکن ہم جیسے ہیں ہی کتنے ؟

''ممی! رشید بھائی یاد ہیں؟'' اُس دن رشید بھائی میرے دِل و دماغ پر حاوی ہو گئے تھے۔

''تجھے کیسے آج اُن کی یاد آ گئی؟ ماں 130 کے سوال کے جواب میں ''بس ایسے ہی'' کے انداز میں ہلکا سا میں مسکرایا۔

''پرانا گھر کیا چھوڑا رشید بھائی ہی چھوٹ گئے۔ تیرے پاپا بعد تک بھی جایا کرتے تھے اُن سے ملنے لیکن کام دھندے میں برکت ویسی نہ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے آنا جانا چھوٹ گیا تھا، اور پھر تیرے پاپا بھی.....''، میں اُن کے جملوں کی نمی پر غور ہی کر رہا تھا کہ وہ بولیں ''پتا نہیں زندہ بھی ہیں یا..... کس حال میں ہونگے ایشور جانے؟''

ممی کی بات سے اچانک پھر میری روح کانپی۔ وہ تو نہیں لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ یہ وقت پھر سے رشید بھائی جیسوں کی اَگنی پرکچھا کا ہے۔ فضا اُن کے موافق کہاں ذات کے کاریگر، مذہب کے مسلمان اوپر سے غریب۔ اُن جیسوں کی قسمت تو بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ من میں بڑھتے جوش کے بعد لہریں جب تھمتیں تو میں پھر رشید بھائی کے ساتھ خود کو پاتا۔ ''کتنے الگ طرح کے انسان، اپنے سبھی ہندو گراہکوں کی کتنی عزت کرتے تھے۔ یوں ہی پاپا اُن کی تعریف کرتے تھے کیا؟'' میرے اندازے پھر سے ایک شکل گڑھتے اور زمانے کے چلن میں رشید بھائی کا چہرہ اور زیادہ قابل رحم صورت میں اُبھرتا۔ خیالوں میں تراشے اُن کے پیکر پر بیچارگی کے علاوہ مجھے کچھ نہیں دکھائی پڑتا۔ دِل و دماغ پر حاوی ہوتے جا رہے رشید بھائی کے خیال کو میں نے بڑی مشکل سے کچھ دیر کے لئے جھٹکا۔

اگلے دن کا حال نہ ہی پوچھئے تو بہتر ہے۔ میں روز کی طرح اسکوٹر پر اسکول کی طرف جا رہا تھا۔ چوراہے پر ریڈ لائٹ نے کچھ لمحہ آس پاس دیکھنے کی مہلت دی۔ نظر گھمائی ہی تھی کہ یہ کیا؟ میرا دِل دھک سے رہ گیا۔ دماغ کی ساری نسیں اچانک ہی مجھے بے حد تنی ہوئی اور گرم محسوس ہوئیں۔ اسکوٹر کے ہینڈل پر میرے ہاتھوں کا دباؤ اچانک پگھل کر غائب سا ہونے لگا۔ مجھے اپنے دونوں ہاتھ شَل سے محسوس ہوئے۔ داہنی جانب بھیڑ میں کچھ آگے ایک آٹو کے پیچھے لکھے لفظوں نے مجھے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

''چلے زندگی کی گاڑی، عزت کی روٹی = اللہ کرم ہو تیرے بندے رشید پر''

''عزت کی روٹی اور رشید'' ان جملوں نے میری ساری حسوں کو بیدار کر دیا۔ ماضی سامنے کھڑا ہو گیا۔ رشید بھائی کے الفاظ یادوں کے خانے سے سر اٹھانے لگے۔ لیکن گرین لائٹ میں تیس سیکنڈ کا بچا وقت.....آٹو کی دوری اور اپنے اسکوٹر کو اکیلے چھوڑ کر جانے کے خیال نے سبھی آفتوں کو ایک ساتھ مجھ پر لاد

دیا۔ میں نے سیٹ پر ہی ترچھے ہوکر آٹو رکشہ والے کو نظروں کے دائرے میں لانے کی بھرپور کوشش کی مگر ناکام رہا۔ من کی آنکھوں سے صاف دِکھ رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ رشید بھائی ہی ہیں۔ تیزی سے چوپٹ ہو رہے سلائی کے دھندے کو نہ سنبھال پانے اور اپنی ڈھلتی کو پار لگانے کا یہ راستہ اختیار کیا انہوں نے۔ سگنل ہوتے ہی میرے اسکوٹر نے رفتار پکڑ لی جیسے میرے من میں لگا تار ''عزت کی روٹی اور بندہ رشید'' کی دُھن بجنے لگی۔ میں آٹو کی سمت میں بھاگنے لگا۔ بھاگتے ہوئے میری آنکھیں آٹو والے کی وردی کے اندر رشید بھائی کو بے چینی سے تلاش کر رہی تھیں۔ اُس کی پیٹھ، کندھے اور بالوں سے رشید بھائی کی کاٹھی اور حلیہ کا موازنہ کرتا میرا دِل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ میلی کچیلی وردی میں آٹو ڈرائیور کو جب میں نے قریب سے دیکھا تب جانا کہ جملے اس کے بھی رشید بھائی جیسے ہیں لیکن یہ رشید بھائی نہیں ہے۔ دو گھڑی کا وقت لگا دِل کو سنبھلنے میں۔ قابو میں ہوتے ہی دِل نے کہا جملے اس کے بھی کہاں ہونگے؟ وہ تو کسی پینٹر کے ہی ہونگے۔ ملتے ضرور ہیں رشید بھائی کے فلسفہ سے لیکن کون جانے پینٹر کون ہے؟ ہندو بھی تو ہوسکتا ہے۔ لیکن رشید بھائی؟ انہوں نے بھی کہیں کوئی ایسا ہی کام؟..... ہو بھی سکتا ہے۔ ضروری تو نہیں پرویز کلرک ہی لگا ہو ''خرادیا'' بھی تو ہوسکتا ہے نا؟ اور اسلم؟ وہ بھاگ گیا ہو پاکستان اپنے کسی چاچا، تاؤ کے ہاں۔ ایک آتے تو تھے ان کے گھر۔ اکثر اُنہیں کے ساتھ گھومتا دکھائی دیتا تھا اسلم۔ ہماری مکان مالکن جنہیں ہم چاچی کہتے تھے کتنا ڈر گئیں تھیں اُنہیں محلّہ میں دیکھ کر۔ آج بھی اُن کے جملے کانوں میں اُسی دن کی طرح زندہ ہیں ''کیسی ڈراؤنی تو آنکھیں ہیں..... ابھی چہرے سے نکل کر خون کر دیں کسی کا۔'' مجھے یاد ہے پاپا کتنا ناراض ہوئے تھے اُن سے لیکن اُس دن کے بعد جب بھی مجھے اسلم کے چاچا دکھتے میں ڈر جاتا۔ اُن کے چہرے کے ساتھ چاچی کے جملے کسی تنبیہ کی طرح چسپاں ہو گئے تھے۔ پتا نہیں اُس کے چاچا رہتے کہاں تھے؟ کہیں رشید بھائی شہر چھوڑ کر چلے تو نہیں گئے اُن کے پاس؟..... آخر کیسے جی رہے ہونگے رشید بھائی؟ میرے دِل میں اچانک رشید بھائی کے لئے رحم کا سیلاب اُمڈ پڑا۔

''اس میں اتنا بھی کیا پریشان ہونا؟ چلے جاؤ کسی دن اپنے پرانے محلّہ یا اُن کی دوکان پر۔ یہاں بیٹھے سوچتے رہنے سے کیا حاصل ہوگا بھلا؟ شکھا میری پریشانی کا اندازہ لگاتے ہوئے بولی۔

''اور ملنے پر کیا کہوں گا..... کیوں آیا ہوں؟'' میں نے سوال داغ دیا۔

''کہہ دینا ملنے اور کیا۔''

''اتنے برسوں کوئی کھوج خبر لی نہیں اور اب اچانک .....'' شکھا مطمئن تھی لیکن میں تذبذب میں مبتلا تھا۔

''تو کہنا کپڑے سِلوانے کے لئے اور کیا؟''شکھا نے بلا تاخیر کہا۔ میں جتنا الجھا ہوا وہ اتنی سلجھی ہوئی۔اس کی بات سے جیسے مجھے سکون اور راہ دونوں ایک ساتھ مِل گئے۔ادھر ذرا سا اطمینان ہاتھ آیا ہی تھا کہ ایک بھاری شرمندگی بھی اُسی راہ چلی آئی۔رشید بھائی کی فکر میں اپنا قصور بھی مجھے صاف دکھائی دینے لگا۔جب میں والد صاحب کے نقش قدم پر تھا اور ریڈیمیڈ کپڑے میرے لئے آفت ہو رہے تھے تب کیوں میں نے رشید بھائی کو اب تک نہیں ڈھونڈا۔کیوں میں نے اپنے سکون کو قربان ہونے دیا۔کیوں نہیں پاپا کی ہی طرح اپنی پسند کو ترجیح دے پایا اور کیوں میں نے نئے زمانے کے نئے چلن کی تیز آندھی میں سب اُڑ جانے دیا۔اچانک میرے ضمیر پر پچھلے کئی برسوں میں اجڑ گئے درزیوں اور ٹھپ پڑ گئے اُن کے کام دھندوں میں اپنا کیا قصور ناگوار گزرنے لگا۔مجھ جیسے قصورواروں نے ہی رشید بھائی جیسوں کی حالت بدتر بنا دی۔کل تک میں جن بڑے برانڈ کے ریگستانی ڈھیروں کو کوس رہا تھا آج اُن ہی ریتیلی عمارتوں کی اونچائی پر میں نے خود کو کھڑا پایا۔اُس اونچائی سے جب میں نے نیچے کی طرف دیکھا تو درزیوں کے بند ہوتے دھندے اور محلّہ میں سلائی مشین لے کر پرانے کپڑوں کو درست کرتے ایک آدھ بیچارے سے کاریگر ہی دکھائی دیئے۔حالت یہ ہوگئی ہے کہ اب گھروں میں بھی سلائی مشین رکھنے کا چلن ختم ہو گیا ہے۔''یوز اینڈ تھرو''(Use and throw) کے چلن نے پرانی چیزوں کے ساتھ ہر پرانی رسم ورایات کو بھی لات مار کر نکال دیا۔پرانے کام دھندوں اور ہنر کی ایسی بے عزتی سے میرا من کانپ گیا۔میں نے عہد کیا کچھ بھی ہو کل مجھے ہر حال میں رشید بھائی کے بارے میں پتا کرنا ہے۔دِل کا ایک کونا یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ پرانی قدروں کو اڑاتی اس تیز آندھی کے میرے جذبات وخیالات کتنی دیر ٹک پائیں گے ؟لیکن دِل کہتا تھا کہ چاہے کچھ ہو ڈر کے مارے ہر بار شتر مرغ بن کر جینے سے کیا فائدہ؟ اور پھر کون سوچے گا ان کے بارے میں؟ میں خود کو دلاسا دیتا،تمام خوف اور اندیشوں پر فتح پانے کے کسی پوشیدہ راز میں کھو گیا۔رات بھر میں بازار کا پرانا نقشہ دماغ میں بناتا رہا۔گھومتا رہا اُن گلیوں میں اور کھویا رہا اپنی فکروں میں۔آج پاپا بھی بہت یاد آرہے تھے۔کتنے زندہ دل انسان تھے۔اپنے فیصلوں کو پُر وقار انداز میں جینے والے، یہ آج گہرائی سے سمجھ میں آرہا تھا۔''جگ بھاتا نہیں، من بھاتا کرنے والے۔'' اُن کے خبطی مزاج

کی قدر آج میری نظر میں بڑھتی ہی جارہی تھی ۔اُس مزاج اور انداز کا جس کا اُن کے بیوی بچوں نے خوب مذاق اڑایا تھا۔ ماں کتنی بار کہتیں'' کیا تم بازار بازار کرتے رہتے ہو۔ بازار ایسا ہو گیا ہے بازار ویسا ہو گیا، بازار نے یہ کر دیا.....۔'' خود مجھے بھی تو کتنی بار ایسا ہی لگتا تھا، آج اُن کے اصولوں کے معنی سمجھ میں آرہے تھے۔ نئے مکان میں جب تک جمے گھر میں راشن رونق اسٹورس سے ہی آیا۔ زندگی بھر چھوٹے دوکانداروں سے ان کا پیار محبت، بھائی چارے کا رشتہ بنا رہا۔

اگلے دن میں نے اپنا اسکوٹر اٹھایا اور چل پڑا اپنے رشید بھائی کو ڈھونڈنے۔ کئی سال پہلے خالہ زاد بہن کی شادی میں جو شرٹ- پینٹ کا جوڑا مجھے مِلا تھا اسے ایک جھولے میں ڈال کر شکھا نے مجھے دے دیا۔ برسوں سے وہ جوڑا اسی جھولے میں قید تھا۔ ویسے بھی اب شادی بیاہ پر ہم جیسے لوگوں کے خاندانوں میں ہی اسی طرح کے جوڑے تحفتاً دیئے جاتے تھے۔ پرانی رسموں کی طرح یہ بھی رسم ادائیگی ہی تھی۔ جوڑے کے ساتھ میں نے اپنے تمام سوال اور خیال بھی اسی تھیلے میں ڈال لئے اور نکل پڑا منزل کی جانب ۔جیسے جیسے دوری طے ہوتی جارہی تھی میری دُھن کو بھی پنکھ لگتے جارہے تھے۔ ماضی میرے دماغ سے ہو کر میری آنکھوں میں اترتے ہوئے بازار کا ہیولا تیار کر رہا تھا اور زندہ ہوتے جارہے تھے وہ مناظر جن پر میں جان دیتا تھا۔

''ایک بار مِل جائیں رشید بھائی پھر اپنے سبھی دوستوں اور مِلنے والوں کو بھی اُن کی دوکان کا راستہ دکھا دوں گا۔ برسوں سے ٹھپ پڑا اُن کا دھندا پھر آباد ہوگا۔ رشید بھائی کا سکہ پھر سے جم جائے گا۔'' یہ سب سوچ کر میرا جوش بڑھتا ہی جارہا تھا۔ یہ جوش برسوں کی دوری کو پاٹتا خوشی کی لہر میں تھا۔ اپنی ٹھیک ٹھاک یادداشت کے سہارے میں بازار میں پہونچا تو اس کی صورت بالکل بدل چکی تھی۔ میں نے بچپن میں اسے جس شکل میں دیکھا تھا اس کا کوئی بھی نشان آج باقی نہیں تھا۔ ماضی میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے بازار بالکل ویسا ہی رہا جیسا میرا بچپن۔ جیسے وہیں ٹھہر گئی میری عمر لیکن اس وقت حقیقت سے سامنا ہوتے ہی مجھے دکھائی دینے لگا میری دونوں عمروں کے بیچ کا فاصلہ۔ اس فاصلے پر دھیان جاتے ہی سحر ٹوٹنے لگا۔ یہ بازار بھی اور بازاروں کی طرح بدل گیا ہے جو محلّوں کی بازاروں اور مالز کی درمیانی شکل لئے ہوئے تھے ۔ مجھے دِکھنے لگیں چم چم کرتی شاندار دوکانیں، پھُر تیلے سیلس مین اور موٹا گراہک۔ گاڑیوں سے پٹے راستے اور دھکا کلی کرتے خریداروں کا ریلا۔ مالز جتنی جگہ تو یہاں ناممکن تھی لیکن اُن کی برابری کی دُھن میں

ہر دوکان اپنی سجاوٹ میں نرالی دِکھ رہی تھی۔ مین روڈ کی کڑھائی، سلائی اور کپڑوں کی اُن دوکانوں کا نام و نشان تک نہ تھا جو میرے ذہن میں آج تک زندہ تھیں۔ وہاں تھیں تین منزلہ دوکانیں، عالیشان اور پُر رونق دوکانیں۔ میں پالی تھین بیگ میں کپڑا لئے اُن سے گزرتا ہوا جا پہنچا اُس گلی کے سرے پر جہاں سے چالیس پچاس قدم پر تھی منت ٹیلرس کی دوکان۔ میں نے غور کیا بازار کی طرح گلی بھی بہت بدل گئی ہے۔ ہاتھ کے کاریگروں کے دھندے وہاں سے اُٹھ چکے تھے۔ کہاں چلے گئے ہونگے وہ خاندان؟ کیا ہوا ہوگا اُن کے خاندانی ہنر کا؟ کیسے کما کھا رہے ہونگے اب؟ شہروں میں تو اُن کی مانگ اب ختم ہوئی۔ شاید گھسے ہونگے نامعلوم سی قصبائی گلیوں میں کہیں۔ کچھ کو بڑے ڈیزائنرز اور کمپنیوں نے معمولی تنخواہ پر رکھ لیا ہوگا۔ کچھ ملک کے دوسرے حصوں میں معمولی اجرت پر بغیر کسی بنیادی سہولت کے غیر ملکی کمپنیوں کے ٹیلر ہو کر رہ گئے ہونگے۔ یعنی کپڑا ہمارا، مزدور ہمارا اور منافع ٹیگ دھاری کمپنی کا۔ ان کے علاوہ شہر میں جو باقی بچے بھی ہونگے وہ اپنے اندر کے فنکار کو مار کر الٹریشن جیسے معمولی کاموں سے پیٹ پال رہے ہونگے۔ نہ جانے کیسے؟ میرے لئے رشید بھائی کی تلاش آج صرف ایک انسان کی تلاش نہیں رہ گئی تھی۔ اب کئی اور تصویریں اُن میں شامل ہو کر اُبھرنے لگیں۔ وہ سوال سر اٹھانے لگے جن کے بارے میں میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ سب میرے لئے ''چلتا ہے'' جیسا ہی تو تھا۔ اپنے سبھی سوالوں کے ساتھ دماغ میں یہاں آنے کا مقصد ایک بار پھر جاگا۔ رشید بھائی کو ڈھونڈنا ہی تھا۔ قدم آگے بڑھے تو میں نے دیکھا گلی کے دونوں طرف کچھ گودام سے بن گئے تھے۔ اندر کے مکان کافی اسٹائل میں بنے کھڑے تھے۔ جبکہ پہلے یہاں کونے کا کھنّہ جی کا ''کھنّہ نواس'' کا بورڈ لگا مکان ہی خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے آج شاندار شوروم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لیکن یہ کیا؟ ماضی کی گلی کا جب میں حال سے موازنہ کرتا منت ٹیلرس پر پہونچا وہاں چائے کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ میں نے دھیان سے دیکھا کہ باقیات کی شکل میں ''منت ٹیلرس'' کا بورڈ بھی ندارد تھا۔ میری اُمید پل بھر میں آسمان سے زمین پر دھڑام ہوگئی اور آس کی پسلیاں درد سے کراہنے لگیں۔

''بھائی! یہاں منت ٹیلرس کی دوکان تھی پہلے۔'' چائے والے سے سوال کر میں نے درد سے کراہتی امید کو جیسے تیسے زندہ رکھنے کی کوشش کی۔

''ہوتی ہوگی بابو جی، میں تو تین- چار سال پہلے ہی آیا ہوں۔ میں نہیں جانتا۔ پورا علاقہ بدل

گیا ہے۔نہ پرانے دوکاندار رہے اور نہ مکان مالک۔'' چائے والے کے جملوں سے ہوئی مایوسی کے بیچ جیسے ہی میں پلٹا وہ بولا۔''کونے کی جو دوکان ہے نا بابو جی وہ پرانے دوکاندار ہیں، شاید کچھ جانتے ہوں۔تھوڑی بہت دوکانیں مارکیٹ کے سب سے پچھلے حصہ میں چلی گئیں ہیں یہاں تو بس بڑی بڑی دوکانیں ہیں۔مین روڈ ہے نا۔'' میرے پست حوصلے نے پھیکی سی ہنسی میں اس کا شکریہ ادا کیا، جو نہ کے برابر ہی تھا۔رشید بھائی کو تلاش کرنے کی آگ پر ٹھنڈا پانی پڑ گیا تھا۔پالی تھین بیگ پر میری مضبوط پکڑ بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ایک آخری امید میں مارکیٹ کے پچھلے حصے کی طرف جانے سے پہلے میں اُس کونے کی دوکان کی طرف بڑھا کہ شاید کچھ پتا چل سکے۔اِنفی نٹی (Infinity) نام کی تین منزلہ دوکان کے ہر فلور پر رنگ برنگے کپڑے جگمگا رہے تھے۔باہر سے آیا میرے ساتھ گرمی کا پارا اے-سی کی ٹھنڈک میں اترنے لگا۔کانوں میں کسی تیز گانے کی دھن سانے لگی، اُسی کے ساتھ چلا آ رہا تھا گراہکوں کا تیز شور۔دوکان میں داخل ہوکر میں نے مالک کو پوچھا تو بے حد مصروف سیلس مین نے آٹومیٹک سیڑھیوں کی سمت میں دیکھتے ہوئے تیسری منزل کا اشارہ کیا۔میرا دِل اگرچہ اداس تھا مگر نظر ہر منزل پر بچوں، عورتوں اور مَردوں کے کپڑوں، خریداروں کی بھیڑ اور مصروف کاؤنٹرس کی اَن دیکھی نہ کر سکی۔تیسری منزل کے دو حصوں میں ایک طرف شاندار آفس تھا تو دوسری طرف کپڑوں کا سیکشن۔آفس کی شان تھا دیوار میں جڑا شیشے کا بڑا سا پینل جس سے نیچے کے بازار کی رونق اندر آتی ہوئی معلوم پڑتی تھی۔

''جی؟ کمپیوٹر پر حساب میں الجھے مالک نے مجھے ایک نظر دیکھتے ہوئے پھر اپنی آنکھوں کو اسکرین کی طرف پھیر لیا۔اُس کا ''جی'' کافی وزنی محسوس ہوا مجھے۔اس کے اس قدر روکھے انداز کے باوجود میں نے اپنی بات کہی۔

''کچھ جاننا تھا آپ سے۔''

میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے یہ جانتے ہوئے بھی میں نے پوری بے شرمی کے ساتھ کچھ رک کر کہا ''یہاں منت ٹیلرس کی ایک دوکان ہوا کرتی تھی۔رشید بھائی کی.....انہیں کے بارے میں پتا کرنا ہے.....کسی نے بتایا آپ کافی پرانے بسے ہیں اس جگہ۔'' اچانک مالک نے خود کو کمپیوٹر سے آزاد کیا اور میرے چہرے کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگا۔مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا..... پتا نہیں یہ کیوں گھور رہا ہے؟ ایک جانکاری کے بدلے میں اس کا اس طرح گھورنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔شاید

میرے آنے سے اس کے کام میں خلل پڑ گیا 136 تھا۔

'' آپ سمیر ہیں نا؟ ماس ساب کے بیٹے؟'' اُس کے ان دو سوالوں سے تھیلا میرے ہاتھوں میں جکڑا رہ گیا اور میری آنکھیں حیرت کی آخری حد تک پھیل گئیں۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا مالک بولا'' آج کیسے راستہ بھول گئے آپ؟ اتنے سالوں بعد؟ میرا دماغ سو گنا تیز رفتار سے ماضی کو کھنگالتے ہوئے اس آدمی کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ میری پیشانی پر پڑی سلوٹوں کے ساتھ ہی میری آنکھیں پھیلیں اور اب سکُڑ کر دوربین بن گئیں۔ میں اس کے لینس کو گھماتا مالک کے چہرے کو اپنے ایکدم قریب لے آیا۔ کلوزاپ میں چہرے کی لکیریں اور نسیں سب ابھرنے لگیں۔ کہاں دیکھا ہے اسے؟ کون ہے یہ؟..... کے سوالوں میں میں الجھا ہی تھا کہ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آیا۔

''میرا حلیہ کافی بدل گیا ہے لیکن آپ کا چہرہ بالکل وہی ہے..... میں اسلم .....سمیر بھائی! پہچانا ؟'' اسلم کے جملے مجھے گرمجوشی سے چھو رہے تھے۔ اُسے اچانک پاس آیا دیکھ میں کچھ کہتا کہ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اس کے ہاتھوں کی پکڑ کسی گہری دوستی سی مجھے سہلا رہی تھی اور میں خود کو اس کے حوالے کئے دے رہا تھا۔ اگلے ہی لمحہ اس نے مجھے تھام کر اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھایا۔

''ابا آج تلک یاد کرتے ہیں آپ لوگوں کو۔ ماس ساب کا ذکر چلتا رہتا ہے گھر میں۔ یقین جانئے وہ دور کب کا بیت گیا لیکن آپ جیسے کتنے لوگ ہمارے دِلوں میں بسے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے پرانا کام بند ہوا۔ بازار اتنا تیز رفتار ہوا کہ ہاتھ سے کام کرنے والے بُری طرح پچھڑ گئے۔ ایک ایک کر کے کئی دوکانیں بند ہوئیں پھر بِک گئیں اور کچھ بازار میں ایکدم پیچھے سمٹ گئیں۔ ابو کئی سال سنبھالتے رہے جیسے تیسے۔ لڑکھڑاتے ہوئے گرے بھی کئی بار۔ بڑا بُرا دور تھا ہمارا۔ ابا کے لاکھ چاہنے پر بھی ہم دونوں بھائیوں میں سلائی کا خاندانی ہنر نہ اتر سکا لیکن بھائی جان اور میں آپ کے والد کی توجہ سے پڑھتے رہے۔ میری حالت تو آپ جانتے ہی تھے.....لیکن میں نے پڑھائی چھوڑی نہیں۔ بھائی جان تو شروع سے ہی پڑھائی میں اچھے تھے اب باہر سٹل ہو گئے ہیں اور میں ایم-بی-اے-کرنے کے بعد ابو کے ساتھ لگ گیا۔ کپڑے کا کاروبار ابو کی جان ہے۔ انہوں نے اپنے والد کا ساتھ دیا اور میں نے اُن کے ساتھ کھڑا ہونا مناسب سمجھا۔ آخر اولاد پر والدین کا بھی حق ہے نا؟ بھائی جان بھی پوری مدد کرتے ہیں ہماری۔ بس اور ابو اور ان کی مدد سے ہی دھیرے دھیرے اس انفی نٹی نے شکل پائی ہے۔ باقی جو ہے سو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ہم

دونوں نے ابو کو کام سے ایکدم فارغ کر دیا ہے پھر بھی تیوہار پر شوق سے آج بھی قینچی اٹھا لیتے ہیں۔'' اُس کی مسکراہٹ مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔ ماضی سے آج تک کا پُل بناتے اسلم کے لفظوں کی تازگی میری مُردنی پر بھاری تھی۔

''اور سناؤ ؟ کیا چل رہا ہے؟''

''اسکول میں پڑھاتا ہوں۔'' چار لفظوں کو بے حد ٹھہر ٹھہر کر میں بول پایا۔ نہ معلوم وہ کس گہری خندق سے نکل رہے تھے۔

''آپ بھی ماس ساب'' اسلم کے لفظ نرم تھے لیکن وہ میرے سینے پر وزنی چوٹ سے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی کرسی اور میری کرسی کے بیچ کوئی میز نہیں بلکہ ایک لامتناہی سمندر موجیں مار رہا تھا۔ کچھ بھی نہ کر پانے کی حالت میں میں پالی تھین بیگ کو چھپانے کی دِل و جان سے کوشش کرنے لگا۔ میں اسے جتنا چھپاتا وہ اپنی چُرمُر کی آواز سے اور زیادہ ظاہر ہوتا۔

''تھیلا میز پر رکھ دیجئے نا.....اطمینان سے بیٹھئے آپ۔''

اس کے لفظوں سے میری جان سوکھنے لگی۔ میز پر رکھتے ہی تھیلا کپڑوں سمیت سارا راز فاش کر دے گا اور ظاہر یہ ہوگا کہ میں آج ان کی اپنے مطابق سوچی ''گرتی حالت'' پر رحم کھانے آیا ہوں۔ دھڑکتے دل سے میں دعائیں مانگنے لگا کہ یہ زمین پھٹ جائے اور تھیلا اس میں سما جائے یا پھر ایسی آندھی چلے کہ اسلم کی آنکھیں دھول سے بھر جائیں۔ یہ تھیلا اُڑ کر مجھ سے میلوں دور چلا جائے اور وہ اسے دیکھ نہ پائے۔ مجھے خود پر اور تھیلے پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی گود میں ہاتھوں کی آڑ کرتے ہوئے چھپا لیا۔ آڑ نے تھیلے کو کافی حد تک چھپا لیا تھا۔ ہاتھوں کو ہلائے بغیر میں نے اس کی چُرمُر بھی بند کر دی تھی۔

''ابھی کچھ دیر میں ابا بھی آتے ہونگے۔ کبھی کبھار آتے ہیں دوکان پر۔ دِل نہیں لگتا نا گھر پر۔ اور پھر اس جگہ سے پرانا یارانہ جو ٹھہرا اُن کا۔''

اسلم کی اس بات سے مجھے اور دھکا پہنچا۔ اُس سے مِل کر جتنا میں نے جانا تھا اُتنے بھر سے ہی میں وہاں سے بھاگنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا، لیکن اب ساری سمتیں میرے لئے بند ہوگئی تھیں۔ صبح تک جن رشید بھائی سے ملنے کے لئے میں مرا جا رہا تھا اب اُن سے بچنے کا موقع تلاش کرنے لگا لیکن اس کا موقع ملنا ناممکن تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا دماغ کوئی بہانہ تلاش کرتا یا وقت مجھے سنبھلنے کی مہلت دیتا، اسلم بولا''

دیکھئے ابو آ گئے۔''

اسلم کے جملے اور اشارے کی جانب جب میں نے شیشے کے پینل سے نیچے جھانکا تو ایک گاڑی دکھائی دی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور بڑے ادب سے رشید بھائی کو اتارا۔ رشید بھائی جتنے اطمینان سے اوپر آ رہے تھے اُس سے چار گنا تیز رفتار سے آتے ہوئے طوفان میں مَیں گھرتا جا رہا تھا۔ دِل چاہا میں بھی کسی غیبی طاقت سے اپنے تھیلے میں چھُپ جاؤں۔ اُنہیں سامنے جو دیکھا، دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُن کی عمر ضرور بڑھی تھی لیکن اس سے زیادہ بڑھے تھے اُن کے ٹھاٹ باٹ۔ بالوں کو انہوں نے کسی خضاب کا رنگ نہیں دیا تھا۔ اپنی سفیدی میں اُن کے بال بہت اچھے لگ رہے تھے۔ چہرہ ایکدم صفاچٹ اور اس پر غضب کی لالی اور رعب۔ جسم پہلے سے کچھ زیادہ بھاری ہو گیا تھا۔ اور اسی تناسب میں چہرہ بھی بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ اُن کے جسم کے کپڑوں اور ہر چیز سے نفاست جھلک رہی تھی اور میں اُس ٹھاٹ کے باڑھ میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ تعارف کے بعد ماحول میں ایک بزرگ کا اپنا پن داخل ہو گیا۔ مجھ سے ملتے ہی اُن کے چہرے سے بیاں ہوتی خوشی اور جوش میں پوشیدہ لرزش کو میں نے صاف محسوس کیا۔ پاپا کی موت کا اُنہیں بے حد افسوس تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آفس میں پھیلے ہوئے دُکھ کی چادر کو انہوں نے اپنے لفظوں میں سمیٹا ''بیٹا! یہ تو عمر بھر کا دُکھ ہے۔ جانے والے کی یادیں رہ جاتی ہیں بس۔'' بعد میں انہوں نے میرے کام وغیرہ کے بارے میں پوچھا تو اُن کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔

''میں جانتا تھا تم بھی اپنے والد جیسے ہی بنو گے۔ دِکھتے بھی انہیں کی طرح ہو۔ چاہتے تو ہم بھی تھے بیٹا! کہ ہمارا کوئی بچہ بھی پڑھ جائے..... پڑھے تو تینوں خوب لیکن پڑھانے والا کوئی نہ نکلا۔'' اُن کی حوصلہ افزائی کی مہر کے نیچے میں اپنی تمام اٹکلوں سے ایک ادنیٰ سا انسان لگ رہا تھا۔ کہاں وہ اور کہاں میں؟ اُن کے اظہار مسرت کا جواب میں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے دیا۔ اگلے ہی لمحہ میرے اندر کے وہم ایک بار پھر مضبوطی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''منت کیسی ہے انکل؟ اب تو وہ بھی گھر گرہستی والی ہو گئی ہو گی؟'' میرے سوال پر رشید بھائی مسکرائے۔

''ارے! یاد ہے تم کو اس کی؟ بھئی! من کی مالک ہے وہ۔ ہماری آن اور شان۔ بانو ڈاکٹر ہو گئی ہیں۔ ہارٹ اسپشلسٹ۔ پہلے کہتی تھی نکاح اپنی پسند سے کرے گی۔ ہم بھی انتظار کرتے رہے۔ اب

(Quarterly) ISSN : 2582-1229

TAREEKH E ADAB E URDU

International Peer Reviewed Refereed Journals

Vol. No. 2 April–June 2020 Issue No. 2

Editor : Dr. Md. Yahya

Published & Printed by Dr. Md Yahya, On The Behalf Of Dr. Md Yahya
2496/2, Punjabi Basti, Subzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi - 110007, Printed at
J.k. Offset Printing Press, 315 Gali Garahya, Jama Masjid, Delhi - 110006, Editor - Dr. Md Yahya

Price : 200/-